اسلام اور مستشرقین

جلد پنجم

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ن ، شبلی اکیڈمی ، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)

اسلام اور مستشرقین

(جلد پنجم)

از

(مولانا) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی سنہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

اس میں اسلامی علوم وفنون سے مستشرقین کی دل چسپی اور خدمات کا ذکر ہے،

پھر اسلام اور شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام پر

ان کے اعتراضات کے جوابات ہیں۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن رح

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (ہند)

سلسلۂ دار المصنفین نمبر: ۱۵۳

کتاب : اسلام اور مستشرقین (جلد پنجم)

مصنف : علامہ سید سلیمان ندویؒ

مرتب : سید صباح الدین عبد الرحمنؒ

صفحات : ۱۴۶

ایڈیشن : ۲۰۰۴ء (طبع دوم)

کمپیوٹر کتابت : کریئیٹیو کمپیوٹر، اعظم گڈھ

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

ناشر : دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

قیمت :

باھتمام

عبد المنان ہلالی

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین

جلد پنجم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ	۱-۲	ڈنمارک	۲۸
یورپ کے مستشرقین اور	۱	اسپین وپرتگال	۲۹
کتب خانۂ اسکندریہ		اٹلی	؍؍
مخالفین اسلام	۱۷	۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۰ء تک	
اور جزیہ		فرانس	۳۰
۱۸۰۰ء سے پہلے کے مستشرقین یورپ	۲۱	انگلینڈ	؍؍
فرانس	۲۵	جرمنی	۳۱
جرمنی	۲۶	اٹلی	؍؍
سوئزرلینڈ	؍؍	۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۰ء تک	۳۲
انگلینڈ	۲۷	فرانس	۳۲
ہالینڈ	؍؍	جرمنی	۳۴
آسٹریا	۲۸	سوئزرلینڈ	۳۶

مضمون	صفحہ
انگلینڈ	٣٦
ہالینڈ	״
ایشیاٹک سوسائٹیاں	٣٧
سنہ ١٨٥٠ء سے سنہ [illegible] تک	
فرانس	٣٨
جرمنی	٤٢
آسٹریا	٤٧
ہالینڈ	٤٨
انگریز	٤٩
روس	٥٠
اسپین	٥١
سنہ ١٨٧٠ء سے سنہ ١٨٨٠ء تک	
فرانس	״
جرمنی	٥٤
روس	״

مضمون	صفحہ
اشاعت اسلام پر ایک جرمن	
مستشرق کا لکچر	٥٧
مستشرقین یورپ اور محبت نبی	٦٥
اور اسلام	
مستشرقین یورپ اور محمدؐ	٨٣
عمر الواقدی	
پھر واقدی	١٠٣
(پروفیسر گولیم یونیورسٹی	
انگلینڈ کے خط کا جواب)	
رومن کیتھولک تاریخ کی چند	
من گھڑت کہانیاں،	١٢٣
اساطیر الاولین،	١٢٩

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اس کتاب میں حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے رسالہ الندوہ لکھنؤ اور معارف میں لکھے تھے، الندوہ میں اب سے چھپن برس پہلے مضامین لکھے، اس کے بعد مستشرقین نے جو زہر چکانیاں کیں ان کے جوابات معارف میں برابر دیتے رہے، ایسے تمام مضامین کا یہ مجموعہ ہدیۂ ناظرین ہے، ان کو لکھے ہوئے عرصۂ دراز گذر چکا ہے لیکن ناظرین ان کا مطالعہ غور سے کریں گے، تو ان میں اب بھی تازگی محسوس کریں گے، اور مستشرقین کے اعتراضات سے جو شکوک و شبہات ان کے دل میں پیدا ہو گئے ہوں، وہ ضرور دور ہو جائیں گے،

ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ حضرۃ الاستاذ مستشرقین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے لیکن اُن کی گمراہ کن تحریروں سے باخبر رہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، مستشرقین کے بارہ میں ان کی جو اصل رائے ہے وہ اُن کی تحریر کے حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہو جائیگی،

> یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا، اور اپنے لٹریچر کو نئے اسلوب میں شائع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا، اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم وادب کی حفاظت و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن تاہم چونکہ یہ علوم اُن کے نہ تھے، اس لئے وہ ہمدردی اور محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہو سکتی ہے، ان کو نہیں ہے، اس لئے ان کی تحقیق و تدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے، سخت

نقصان بھی پہنچ رہا ہے، جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و تمدن پر بے پناہ حملہ کر دیا ہے، قرآن مجید حدیث و تصوف سیر و رجال. کلام و عقائد سب ان کی زد میں ہیں، نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچا ہے اور پہونچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا، اور اس کا تریاق تیار نہیں کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک مسلمانوں کے دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔"

اس تحریر کے بعد مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، اور جس سمیت کا ذکر کیا گیا ہے، اسی کو دور کرنے کے لئے دارالمصنفین کی طرف سے اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے مختلف جلدیں شائع کی گئی ہیں، اس سے پہلے چار جلدیں شائع کی جا چکی ہیں، یہ اس سلسلہ کی پانچویں جلد ہے، امید ہے کہ ان تمام جلدوں کے مطالعہ سے وہ اہل علم جو کسی نہ کسی وجہ سے مستشرقین کی تحریروں سے متاثر ہو جاتے ہیں، ضرور مستفید ہوں گے،

مولوی عبدالباری صاحب نے ان مضامین کے الندوہ اور معارف سے نقل کرنے میں کافی محنت کی، اس محنت کرنے میں اُن کو بڑا شوق بھی پیدا ہوا، اس لئے کہ اُن کو حضرۃ الاستاذ کی تحریروں سے بڑی گرویدگی ہے،

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۲۴ر جولائی ۱۹۸۵ء

یورپ کے مستشرقین
اور
کتب خانۂ اسکندریہ

منجملہ ان افسوسناک غلطیوں کے جو تاریخ اسلام کی نسبت یورپ نے کی ہیں، اور منجملہ ان غلط الزامات کے جو یورپ نے مسلمانوں پر قائم کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کا عظیم الشان بطلیموسی کتب خانہ برباد کر دیا، جس کی کتابوں سے چھ مہینے تک مصر کے تمام حمام گرم رہے، یورپ کو ان مقدمات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے، کہ صحابہؓ نہایت وحشی تھے، علم کے سخت ترین دشمن تھے، جن کی نگاہ میں علوم وفنون کی قدر ہمیہ آتش سے زیادہ نہ تھی، (معاذ اللہ)

اس جھوٹ اور مفتریانہ حکایت کی پردہ دری، اصول روایت کے رو سے حضرۃ الاستاذ نے ایک مدت پہلے ایک رسالہ کی صورت میں کر دی ہے، جو اردو، انگریزی، اور عربی تینوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ اس فرضی قصہ کے مسلمان راوی صرف عبداللطیف بغدادی، مقریزی اور حاجی خلیفہ بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے مقریزی کی روایت کا یہ حال ہے کہ وہ حرف بحرف عبداللطیف بغدادی سے منقول ہے، حاجی خلیفہ نے اولاً تو کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق نام تک نہیں لیا ہے۔ بلکہ عام کتب خانہ کا لفظ لکھا ہے۔ ثانیاً وہ خود اس کو ضعیف روایت سمجھتا ہے، جیسا کہ اس کے لفظ "یروی" یعنی بیان کیا جاتا ہے، سے سمجھا جاتا ہے۔ عبداللطیف بغدادی ۶۲۹ھ نے مصر میں اپنے چشم دید واقعات کو ایک رسالہ کی صورت میں جمع کیا ہے۔ اس نے اس رسالہ میں کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے لیکن وہ بھی اس روایت کو ایک عامیانہ روایت سمجھتا ہے جیسا کہ اس کے لفظ یذکر یعنی بیان کیا جاتا ہے، سے مفہوم ہوتا ہے۔ نیز اس نے اس روایت کے تحت میں اور متعدد باتیں بھی ذکر کی ہیں، وہ بھی کتب خانہ اسکندریہ کی طرح بازاری گپیں ہیں۔

اس امر کی سب سے بڑی دلیل کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو نہیں جلایا ہے۔ یہ ہے کہ کتب مغازی وفتوح مصر

جن میں ایک ایک جزئی امر کا ذکر ہے، اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں، حضرۃ الاستاذ نے اس تفصیل کے بعد ان تمام روایات کا سرچشمہ ابو الفرج ملطی کو قرار دیا ہے، جو ایک متعصب عیسائی پادری تھا۔ ابو الفرج نے سریانی میں ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی، اور خود اسی نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جو مختصر الدول کے نام سے مشہور ہے، اسی مختصر الدول میں سب سے پہلے ذکر آیا ہے، کہ کتب خانہ اسکندریہ کو مسلمانوں نے جلایا، لیکن اصل سریانی میں اس کا مطلق ذکر نہیں ہے۔

مصر میں جرجی زیدان ایک عیسائی مورخ ہے، اور عربی کے مشہور رسالہ "الہلال" کا ایڈیٹر ہے، اس نے چند جلدوں میں تمدن اسلامی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، تین سال ہوئے کہ میں نے اردو اور عربی زبان میں جرجی زیدان اور اس کی تمدن اسلامی کی اصلی حقیقت کھولی تھی، اور اس کے مکائد، تدلیسات اور ابلہ فریبی کو ظاہر کیا تھا۔ آج ہم کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلۂ سخن میں اس کی تمدن اسلامی کا ذکر کرتے ہیں۔

جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کی تیسری جلد عربوں کے علوم و فنون کی تاریخ میں لکھی ہے، جس میں اس نے نہایت نامکمل طور سے علوم اسلامیہ کے ماخذ، ابتدا اور ان کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے، اس جلد کا نصف سے زائد حصہ حضرۃ الاستاذ کے مضمون "تراجم" سے ماخوذ ہے، جو رسائل شبلی کے ضمن میں چھپ چکا ہے، یہ جلد اردو زبان میں "علوم عرب" کے نام سے چھپی ہے، جس میں مترجم نے نہایت مبالغہ کے ساتھ علامہ جرجی زیدان کے اس علمی احسان کا تمام دنیائے اسلام کی طرف سے شکریہ ادا کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم احسان ناظلم کے ادائے شکر کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس تیسری جلد میں جرجی زیدان نے کتب خانہ اسکندریہ کا ایک عنوان قائم کیا ہے، جس میں حضرۃ الاستاذ کے چند دلائل کی تردید کر کے اپنی آخری تحقیق کا یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کو مسلمانوں نے ہی جلایا ہے، اور اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں ہے، بلکہ مسلمان جلال الدین قفطی ہے،

اس سے پہلے کہ ہم اصل مسئلہ کی تحقیق کریں، یہ بیان کرنا ضروری ہے، کہ کتب خانہ اسکندریہ کی اصل ماہیت کیا ہے، اسکندریہ جو اب مصر کا ایک آباد شہر ہے، بطلیموسیوں کا دار السلطنت تھا، جو مصر میں اسکندر کے جانشین تھے،

اس خاندان کا پہلا بادشاہ بطلیموس سوطر تھا۔ یہ علم دوست بادشاہ تھا، اس نے ۲۸۵ء ق م میں وفات پائی۔ اسی کے حکم سے اسکندریہ میں ایک کتب خانہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی جس میں یونانی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کے تراجم کا بھی ذخیرہ تھا، جو اسکندر ثانی کے حملۂ فارس کے وقت یونانیوں کے ہاتھ لگی تھیں، سوطر کے جانشینوں جب بطلیموس فلادلف (۲۴۷ء ق م) نے اس کتب خانہ کا حد سے زیادہ اہتمام کیا، اس کے بعد دیگر شاہان بطلیموس بھی اس میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ اسلامی مورخین کے بیان کے مطابق چینتالیس ہزار ایک سو بیس کتابوں سے یہ کتب خانہ معمور تھا[1]، یورپین تاریخوں کی شہادت کی بنا پر یہ کتب خانہ سات لاکھ کتابوں کا خزانہ تھا۔ اس کی پہلی مرتبہ بربادی جولیس سیزر کے ہاتھ سے ہوئی، سیزر نے جب اسکندریہ کا محاصرہ کیا، تو اس کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ پرگاسیس نے کلیوپیٹرا کو جو مصر کی آخری بطلیموسی شاہزادی تھی، اپنا کتب خانہ اسکندریہ کے کتب خانے کے لئے دیدیا، اس طرح سے دوبارہ یہ کتب خانہ آباد ہوا، یہ کتب خانہ سیراپئس میں رکھا گیا تھا، جو بت پرست مصری اقوام کا ہیکل تھا، ۳۹۱ء میں عیسائی بادشاہ تھوڈوسیس کے حکم سے تھیافلیس نے جو اسکندریہ کا ایک متعصب پیٹرپارک تھا، اس ہیکل کو ڈھا کر کنیسہ بنا دیا، جس کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی برباد کر دیا گیا[2]۔

اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی کی یہ حقیقت ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ مسلمانوں کے فتح مصر سے کتنی مدت پہلے یہ کتب خانہ ہمارے متعصب معترضوں کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا، لیکن ان معترضوں کو اپنے دامن کا یہ سیاہ داغ عہد ظلمت میں تو نظر نہیں آیا، اب جدید روشنی میں نظر آنے لگا ہے، اور چاہتے ہیں کہ یہ داغ ان کے دامن سے مٹ جائے، مگر نہیں مٹ رہا ہے، ہمارے معترضوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قدر یہ روشنی بڑھتی جائے گی۔ اس قسم کے سیکڑوں داغ ان کو اپنے دامن پر نظر آتے جائیں گے۔

انہی معترضوں کی صف میں ہمارا دوست جرجی زیدان بھی ہے، وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل رکھتا ہے،

۱۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان سوائے قرآن کے تمام کتابوں کو مٹا دینا چاہتے تھے، صحابہؓ اس بات کے خواہشمند تھے کہ دنیا کی تمام کتابیں مٹا دی جائیں، صرف قرآن کافی ہے،

---

[1] قفطی مطبوعہ مصر ص ۲۳۲ ۔ [2] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا لفظ اسکندریہ۔

۲۔ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں مسلمان قفطی ہے، بلکہ ابو الفرج کی عبارت بعینہٖ قفطی سے ماخوذ ہے۔

۳۔ قفطی، ابو الفرج ملطی اور بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

۴۔ تاریخ اسلام میں کتب خانہ اسکندریہ کے علاوہ فارس کے کتب خانوں کے برباد کر دینے کا بھی ذکر ہے، جیسا کہ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ میں مذکور ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا۔

۵۔ مسلمانوں نے اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلائے، جیسا کہ گبن صاحب نے "رومن امپائر جلد سوم" میں لکھا ہے، کہ سلطان محمود نے ۴۲۰ھ میں جب رے کو فتح کیا تو باطینوں کو قتل کر ڈالا، معتزلہ کو جلاوطن کر دیا، اور فلسفہ کی کتابیں جلا دیں۔

۶۔ مسلمانوں کو کتابوں کے برباد کرنے کا ایسا شوق تھا، کہ وہ خود اپنی کتابیں آپ برباد کر دیتے تھے، جیسا کہ احمد ابن ابی الحواری، سفیان ثوری اور ابو عمر کی نسبت مشہور ہے۔

ان دلائل ستہ کے بعد جرجی زیدان یہ عجیب و غریب نتیجہ نکالتا ہے، کہ،

"ابتدائے اسلام میں عربوں کے علومِ قدیمہ کی جس قدر کتابیں دستیاب ہوئیں، انھوں نے ان سب کو برباد کر دیا۔"

پہلا دعویٰ کہ صحابہ قرآن کے سوا تمام دنیا کی کتابیں مٹا دینا چاہتے تھے، جرجی زیدان کے نزدیک ایسا بدیہی تھا کہ اس کے لیے اس نے کسی دلیل کے پیش کرنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی۔

اس کے ثبوت میں وہ کتب خانہ اسکندریہ کو پیش کرے گا، یا کتب خانۂ فارس کا نام لے گا، جو کتب خانۂ اسکندریہ کی طرح ایک بے بنیاد واقعہ ہے، اس کا ذکر آٹھ نو سو برس کے بعد عربی تاریخوں میں صرف مقدمۂ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ کی ایک ضمنی بحث میں آگیا ہے۔ اگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا قرآن مجید کے ساتھ شغف جو فضائل علم کے بیان سے پُر ہے، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہے، تو پھر رومی اور شامی عیسائیوں کا انجیل کے ساتھ شغف جس میں علم کی فضیلت کی نسبت ایک حرف بھی مذکور نہیں، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا کتنا بڑا

سبب ہو سکتا ہے،

دوسرا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو کہ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں ہے، تو اس انکار سے اصل واقعہ کے ثبوت پر کیا اثر پڑا، اصلی جواب اس کا آگے آتا ہے،

جرجی زیدان کہتا ہے کہ "جمال الدین قفطی، ابو الفرج ملطی اور عبد اللطیف بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے، ان تین ناموں پر ایک نام ہم اور بڑھاتے ہیں، مقریزی نے بھی اس روایت کو لیا ہے لیکن سب سے پہلے جاننا چاہیے کہ یہ کس زمانہ کے لوگ ہیں،

۱۔ عبد اللطیف بغدادی ولادت ۵۵۷ھ، وفات ۶۲۹ھ، مصنف کتاب افادہ،

۲۔ قاضی اکرم جمال الدین قفطی، ولادت ۵۶۸ھ وفات ۶۴۶ھ مصنف اخبار الحکماء،

۳۔ ابو الفرج بن العبری ملطی، ولادت ۶۲۳ھ، وفات ۶۸۵ھ مصنف مختصر الدول،

۴۔ تقی الدین مقریزی، ولادت ۷۶۶ھ، وفات ۸۴۵ھ، مصنف خطط مصر،

ان میں سب سے پہلا شخص بغدادی ہے، اور آخری شخص مقریزی ہے، بغدادی کی وفات ۶۲۹ھ میں ہوئی، اور مقریزی نے ۸۴۵ھ میں وفات پائی ہے، اس سے اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کہ یہ ساتویں صدی کی روایت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھو کہ اس چھ سو برس کے اثنا میں سیکڑوں اسلامی اور غیر اسلامی تاریخیں تصنیف ہوئیں، لیکن کسی نے اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی طرف نہیں کی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اس جرم کا مسلمانوں کی طرف انتساب کسی صحیح ماخذ پر مبنی نہیں ہے،

مقریزی کی شہادت بھی کوئی نئی شہادت نہیں ہے، بلکہ وہ بعینہٖ بغدادی کی عبارت کی نقل ہے، اور دونوں نے اس واقعہ کو "بیان کیا جاتا ہے" کے مجہول صیغہ کے ساتھ نقل کیا ہے[1]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بغدادی اور مقریزی اس واقعہ کو محقق نہیں سمجھتے،

اب قفطی اور ابو الفرج رہ جاتے ہیں، یہ دونوں ہم عصر تھے، ابو الفرج اکیس برس کے سن میں بشپ مقرر ہوا، قفطی کی وفات کے وقت اس کی عمر ۲۳ برس کی تھی، اس واقعہ کے متعلق دونوں کی عبارت بعینہٖ ایک ہے، ممکن ہے، کہ مختصر الدول ابو الفرج کی ابتدائی اور اخبار الحکماء قفطی کی آخری تصنیف ہو، اور مؤخر الذکر کا ماخذ اول الذکر ہو

[1] مقریزی، ج ۱، ص ۱۵۹،

اس بنا پر ابو الفرج کا عربی ترجمہ مشرق میں اس واقعہ کا مشتہر قرار پائے گا، اور لاطینی ترجمہ مغرب میں. اس سے یہ عجیب راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ تاریخ الحکماء للقفطی میں یہ واقعہ عیسائیت کی راہ سے آیا ہے،

یحییٰ نحوی کا فتح اسکندریہ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس آنا، یحییٰ کا حضرت عمروؓ بن العاص سے کتبخانہ کے جلانے کی اجازت طلب کرنا، حضرت عمروؓ بن العاص کا حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دینا، حضرت عمرؓ کا کتبخانہ کے جلانے کا حکم دینا، حضرت عمرو بن العاصؓ کا کتابوں کو حماموں میں تقسیم کرنا، اور ان کا چھ مہینے تک جلتے رہنا، یہ تمام تفصیل قفطی اور ابو الفرج کی تاریخوں کے سوا اور کہیں مذکور نہیں، اور عجیب تر یہ ہے کہ ان دونوں کی عبارتیں حرف بہ حرف ایک ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک اصل ہے، اور دوسری نقل، اگر ابو الفرج کو قفطی کا ماخذ تسلیم کرلیا جائے، تو مسئلہ طے ہو جاتا ہے کہ ابو الفرج جو ایک متعصب عیسائی مورخ ہے، وہی اس قصہ کا موجد ہے، اور قفطی اس کا ناقل ہے، اگر ابو الفرج کا ماخذ قفطی کی تاریخ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے، کہ قفطی نے اس واقعہ کو کہاں سے لیا تو یہ اس وقت حل ہو جاتا ہے، جب ہم ابن ندیم کی کتاب الفہرست[1] میں کتب خانہ اسکندریہ کا ذکر پاتے ہیں، اور اس کو قفطی نے اپنی تاریخ میں لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے، ابن ندیم نے آگے چل کر تصریح کی ہے، کہ یہ اسحاق راہب کی تاریخ سے ماخوذ ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ قفطی نے کتب خانہ اسکندریہ کے دوسرے تفصیلی واقعات جن میں مسلمانوں کے ہاتھ سے اس کی بربادی کا واقعہ بھی شامل ہے، اسحاق راہب کی کتاب سے لیا ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں میں یہ روایت عیسائیت کی راہ سے آئی ہے، اس حالت میں گو اس قصہ کا موجد عیسائی بشپ (ابو الفرج ملطی) نہیں قرار پاتا، مگر عیسائی راہب (اسحاق) تو قرار پاتا ہے، جو مذہباً عیسائی بشپ کا بھائی ہے،

جرجی زیدان اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ کے لئے قفطی کا ماخذ اسحاق راہب کی تاریخ ہی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کے جلانے کی روایت قفطی نے کسی اسلامی تاریخ سے لی ہوگی، لکھتا ہے:-

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانہ کے حالات تو اس نے (قفطی نے) اسحاق راہب کی تاریخ سے نقل کئے ہیں، لیکن اس کے جلانے کا واقعہ کسی اور کتاب سے لیا ہوگا"۔

یہ ایک عجیب ادعا ہے، جب نصف واقعہ اسحاق کی کتاب سے ماخوذ ہے، تو اس کا زیادہ امکان ہے کہ دوسرے

---

[1] فہرست ابن ندیم، ص ۲۴۰، ۲۳۹،

واقعات بھی اس نے اسی کتاب سے لئے ہوں،

ایک اور امر جس کی وجہ سے قفطی کی شہادت ضعیف ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ یحییٰ نحوی اور کتب خانہ اسکندریہ کے جو حالات قفطی نے لکھے ہیں، وہ ابن ندیم کے صفحہ ۲۵۴ سے تقریباً حرف بحرف ملتے جلتے ہیں، لیکن جہاں سے کتب خانہ کے جلانے کی حکایت شروع ہوتی ہے، اس کا ایک حرف بھی ابن ندیم میں نہیں ملتا،

چوتھے نمبر میں جرجی زیدان یہ عجیب دلیل پیش کرتا ہے، کہ مسلمانوں نے فارس[1] کا کتب خانہ جلادیا، جب وہ اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلادیا کرتے تھے، تو یقیناً انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلادیا ہوگا، اگر یہ دلیل صحیح ہے، تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ رومیوں نے ارشمیدس کی کتابیں جو پندرہ اونٹوں پر بار ہوتی تھیں، جلادیں[2]، جولیس سیزر رومی نے اسکندریہ کا شاہی کتب خانہ جلادیا، اس لئے کہ یورپ کی یہ عظیم الشان حکومت علم کی سخت دشمن تھی، خود افلاطون نے سقراط کے پاس جاتے وقت اپنی ادبی تصنیفات جلادیں، ابراہیم نصرانی کی موت کے وقت اس کے عیسائی اعزہ نے اس کی مملوکہ فلسفہ کی نادر تصنیفات جلادیں[3]، ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا، تو انبار در انبار کتابیں جلادیں، عیسائی پادری ٹادرکوئی میڈا نے پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں سلیمنکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابوں میں آگ لگادی، اسپین کے ایک متعصب پادری زینیز نے غرناطہ میں عربی زبان کے دس ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگاکر آگ لگادی، طرابلس الشام میں جب انگریزوں نے صلیبی جنگ میں فتح پائی، تو وہاں کے کتب خانہ کو جس میں تقریباً تیس لاکھ کتابیں تھیں، نہایت وحشیانہ طور پر برباد کردیا، عیسائیوں نے فتح اندلس کے موقع پر ایک نہیں متعدد کتب خانے برباد کردیئے، فرفوریس کی تصنیفات کے تمام نسخے شہنشاہ تھیوڈوسیس نے جلوادیئے (یہ تھیوڈوسیس وہی ہے، جو تاریخی تحقیقات کے رو سے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہے) اس بناپر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ عیسائیوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا،

اس سے مسلمانوں کی برأت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فتوح و مغازی کی سیکڑوں کتابوں میں سے ایک میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے، لیکن جرجی زیدان نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا رد کرتا ہے، کہ فتوح و مغازی کے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہوگا، لیکن جب مسلمانوں میں تمدن آیا، اور وہ تحصیل علم میں مشغول ہوئے،

---

[1] اس پر تنقید آئندہ ہوگی۔ [2] قفطی ص ۴۱۔ [3] ایضاً ص ۴۹۔

اور انکو کتابوں کی قدر معلوم ہوئی، تو انھوں نے خلیفۂ دوم کے عہد کے اس واقعہ کو دور از عقل سمجھ کر حذف کر دیا

جرجی زیدان مسلمان مورخین پر ایک بیجا الزام قائم کرنا چاہتا تھا کہ ان کے متعلق تمام دنیا کا اتفاق ہے، کہ تاریخ و تحقیق و روایت میں دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، تو کیا یہ قرین عقل ہے، کہ مختلف ملکوں کے مسلمان مورخین مختلف زمانوں میں کسی واقعہ کے حذف کرنے پر اتفاق کرلیں گے، شاید ہمارا دوست یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح انجیل کی ترتیب و تحریف کے لئے عیسائی علما کی مجلس منعقد ہوتی تھی، اسی طرح کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ کی تحریف کیلئے دنیا کے کسی گوشہ میں ان مسلمانوں مورخین کی بھی کوئی مجلس منعقد ہوئی ہوگی، لیکن ہم اپنے دوست کو بتانا چاہتے ہیں، کہ اسلام کی تاریخ اس داغ سے پاک ہے،

مسلمان اس سے برأت کے لئے یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ ابو الفرج کی عربی تاریخ درحقیقت اس کی سریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے، اور اس سریانی تاریخ میں اس واقعہ کا مطلق ذکر نہیں، جو ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ واقعہ اس کی عربی تاریخ میں کسی نے بعد میں بڑھا دیا ہے، جرجی زیدان اسکا بھی ذکر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ اس کی عربی تاریخ اس کی سریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے، لیکن ہم حیران ہیں کہ اس امر میں ہم جرجی زیدان کو غلط گو سمجھیں، یا اس کے استاد فانڈیک کے لائق فرزند اڈورڈ امرکی کو جو اپنی فہرست میں صاف صاف لکھتا ہے کہ ابو الفرج نے پہلے اس کتاب کو سریانی زبان میں لکھا، اور پھر اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں منتقل کیا،[1]

یہ ہیں جرجی زیدان کے وہ دلائل جن کی بنا پر وہ مسلمانوں کو علم کا دشمن قرار دیتا ہے،

اب ایک اور امر کی طرف ہم ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے واقعہ کے سلسلہ میں جن موافق اور مخالف اشخاص نے قلم اٹھایا ہے، انھوں نے ایک استدلال کی طرف توجہ نہیں کی، ہم اوپر لکھ آئے ہیں، جن عربی مورخین مثلاً قفطی، ابو الفرج ملطی وغیرہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ سب کے سب آخری چھٹی صدی یا ابتدائی ساتویں صدی کے مورخین ہیں، بغدادی اور قفطی صلاح الدین کے دربار سے متعلق تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس واقعہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، اور یہ وہ زمانہ ہے، جب تمام دنیا کے مسیحی صلیبی جنگ کے جوش سے بھرے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سیکڑوں افترا آت مشہور کر رکھے تھے، ہو سکتا ہے، ان ہی بازاری

---

[1] اکتفاء القنوع، ص ۸۷،

گپوں کو ایک دو مورخوں نے اپنی کتابوں میں بھی جگہ دے دی ہو۔

اب تک جو بحث تھی، وہ اس بات کی تھی کہ اسلامی تاریخیں اس واقعہ کے بیان سے خاموش ہیں۔ اب ہم دکھانا چاہتے ہیں، کہ محققینِ یورپ جو اکثر عیسائی ہوں گے، اس واقعہ کے بارہ میں کیا خیال رکھتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے اس واقعہ کی تردید مشہور مورخ گبن مصنف "تاریخ رومۃ الکبریٰ" نے کی۔ وہ ابوالفرج کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

"میں اس واقعہ کی اصلیت اور اس کے نتائج دونوں کے انکار کی طرف بہت زیادہ مائل ہوں۔ واقعہ بلاشبہہ عجیب ہے۔ مورخ (ابوالفرج) خود کہتا ہے "پڑھو اور متعجب کرو" اور ایک اجنبی (ابوالفرج) کی شہادت جو اس نے چھٹی صدی کے اختتام پر میڈیا کے حدود میں لکھی ہے، نہایت ہی کمزور ہو جاتی ہے جب کہ اس کے قبل کے دو مورخ اس واقعہ کے متعلق خاموش ہیں، یہ دونوں مورخ عیسائی ہیں اور مصر کے باشندے ہیں، ان میں سے پہلا پیاٹر یارک یوٹیکیس ہے، جس نے فتح اسکندریہ کا حال مفصل طور پر لکھا ہے۔ نیز عمرؓ کے یہ سخت احکام، اسلام کے صحیح اور سچے اصول کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، وہ صاف کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابیں جو جنگ میں دستیاب ہوئی ہیں، جلائی نہ جائیں، نیز ناپاک سائنس "تاریخ، شاعری، طب اور فلسفہ کی کتابوں کو بھی مسلمان اپنے کام میں جائز طریقہ سے لا سکتے ہیں۔"

۲۔ موسیو رینان فرانسیسی نے "اسلام اور علم" پر جو مشہور لکچر دیا تھا، اور جو ۱۸۸۳ء میں پیرس میں چھپ چکا ہے، اس میں موسیو موصوف نے کتب خانہ اسکندریہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"اگرچہ کہا جاتا ہے کہ عمرو بن عاصؓ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا، لیکن یہ کذبِ صریح ہے، کتب خانہ مذکور اس سے مدتوں پہلے جل چکا تھا"

۳۔ مشہور علمی مورخ ڈریپر لکھتا ہے:۔

"اس کتب خانہ کی آدھی کتابیں تو جولیس سیزر نے جلا دی تھیں اور باقی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام میں ضائع کرا دیں ...... اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس وحشیانہ بربادی کے بعد بھی یہ

---

[1] تاریخ رومن امپائر فتح اسکندریہ ص ۹۱۲، طبع جدید۔

عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا، تو ہزار سال کی فرسودگی، اور شاید تصرف بیجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد کتب بہت کم رہ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ........ ایک ادنیٰ درجہ کا غریب نحوی (یحییٰ) اس مہتم بالشان کتب خانہ کے قائم رکھنے اور چلانے کے مصارف کا کیونکر متکفل ہوسکتا تھا، جس پر بطلیموس کے شاہانہ محاصل کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا۔ کتب خانہ کے جلنے کی جو مدت (چھ مہینے) بتائی گئی ہے، اس سے کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ جعلی کے کاغذ سے زیادہ برے ایندھن کا ہونا ممکن نہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکندریہ کے حامیوں نے دوسرے ایندھن چھوڑ کر چرمی اوراق جلانے پسند کئے ہوں، جن کی آنچ جیسی تیز ہو سکتی ہے، وہ تو ظاہر ہے، البتہ چراند کے مرجھ[illegible] جل جانے میں شک نہ تھا،

یہی محقق دوسری جگہ لکھتا ہے :

اس طرح وہ عظیم الشان [illegible] کتب خانہ جس کو تاجداران سلسلۂ بطلیموسیہ نے جمع کیا تھا، اور جو سیزر کی آتش زنی سے بچ رہا تھا، [illegible] (تھافلیس) اور متعصب پادری کے ہاتھوں سے برباد ہوگیا۔ (ص ۷۵)

جرمن عالم مسٹر کریل نے بھی اورنیل کانفرنس منعقدہ ۱۸۷۸ء میں ایک خاص مضمون میں پر زور دلائل سے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔[۲]

د۔ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدن عرب لکھتا ہے :۔

کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمر پر لگایا جاتا ہے، اس کی نسبت میں اسی قدر کہوں گا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع و اطوار کے اس قدر خلاف تھا، کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہمل کہانی رائج رہی، اور قبول کی جائے۔ ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہوگئی ہے، کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت ہی صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ سے ثابت ہوسکتا ہے کہ عربوں سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتب خانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کر دیا تھا، جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے ان کی مورتیں توڑ ڈالی تھیں، اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہ تھیں، جو جلائی جاتیں،

---

[۱] معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر، ترجمہ مولانا ظفر علی خاں، ص ۱۴۵ – ۱۴۰۔ [۲] مضمون کتب خانہ اسکندریہ مندرجہ رسائل شبلی مطبوعہ،

ڈاکٹر لیبان اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اس وقت عیسائی شہنشاہ تھوڈوسیس نے نہ کہ حضرت عمرؓ نے جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں بت پرستوں کی تمام عبادت گاہوں کو اور دیوتاؤں کی مورتوں اور کتابوں کو نیست و نابود کر دیا[۱]"

۲۔ موسیو سیدیو اپنی مشہور تصنیف تاریخ عرب میں لکھتے ہیں:۔

"بعض مورخین نے لکھا ہے کہ "عمروؓ بن عاص نے حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا، کہ سراپین کا مشہور کتب خانہ جو اسکندریہ میں ہے، اس کو کیا کیا جائے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کے جلانے کا حکم دے دیا، کہ اگر یہ کتابیں قرآن کے مخالف ہیں تو مضر ہیں، اور اگر موافق ہیں تو ہم کو ان کی ضرورت نہیں" لیکن یہ روایت صحت سے دور ہے، کیونکہ یہ ایک وحشیانہ فعل ہے، جو اطمینان اور سکون کی حالت میں صادر ہوا، (یعنی فتنۂ فتح کے مٹ جانے کے بعد جیسا کہ اس واقعہ کے راویوں نے بیان کیا ہے،) علاوہ اس کے یہ قول کہ قرآن کے موافق ہونے پر وہ کتابیں بے فائدہ ہیں، بالکل ایک احمقانہ قول ہے جس کی نسبت اس مشہور خلیفہ کی طرف نہیں کی جا سکتی۔ جس کی دانائی کو تمام دنیا کی قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، اسی لئے اس واقعہ کو اس کے معاصر مورخین میں سے کسی نے روایت نہیں کی، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ ان کتابوں کے جلانے کا حکم حضرت عمرؓ نے دیا تھا۔ تو ان کی مقدار بہت کم ہوگی کیونکہ بہت بڑا حصہ شہنشاہ تھوڈوسیس کے عہد میں ۳۹۰ء میں جل چکا تھا[۲]"

۷۔ مولفین چیمبرس (انسائیکلوپیڈیا) لکھتے ہیں:۔

"جب جولیس سیزر نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا تو کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ برگاسیس نے ملکہ کلوپیٹرا کو اپنا کتب خانہ دے کر کتب خانہ اسکندریہ کو پھر اپنی پہلی صورت پر آباد کر دیا، یہ کتب خانہ تھیوڈوسیس اعظم کے زمانہ تک رہا، جب اس شہنشاہ نے تمام ملک میں بت پرستوں کے عبادت خانوں کے منہدم کر دینے کا حکم دیا، تو ان کے ساتھ سراپیس کا ہیکل بھی جہاں یہ کتب خانہ تھا منہدم کر دیا گیا، اور ۳۹۱ء میں کتب خانہ میں آگ لگا دی، یہ کتب خانہ عربوں نے نہیں جلایا، جیسا کہ ان پر جھوٹ الزام لگایا جاتا ہے، کم از کم یہ قصہ

---

[۱] تمدن عرب، لیبان، مترجمہ شمس العلماء سید علی بلگرامی، ص ۲۰۳ - ۲۰۲، [۲] تاریخ عرب سیدیو مترجمہ علی مبارک پاشا مصر، ص (۸)۔

نہایت بیہودہ طور سے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[1]۔

۸ - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے محققین بھی اس واقعہ کو قصہ اور کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ فتح اسکندریہ کے ذکر کے بعد وہ ظرافت کے پیرایہ میں کہتے ہیں،

"یہ کہانی ابو الفرج کی زبانی بیان کی گئی ہے، کہ...... عمرو بن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے سراپیس کے کتب خانہ کو برباد کر دیا، اور ان کو پبلک حماموں میں جو بہت کثرت سے اسکندریہ میں موجود تھے، تقسیم کر دیا، ان کتابوں کی چھ مہینہ تک یہ خدمت تھی کہ وہ آگ کے لئے رسد تیار رکھیں[2]۔"

۹ - جارج واحٹ اور جیمس ایڈیلر اپنی تصنیف "جرائم اہل یورپ" میں لکھتے ہیں:۔

اہل یورپ (روم) نے بت پرستوں کو پامال کر دیا، اور ان کی سخت خونریزی کی، شہنشاہ تھیوڈوسیس نے بت پرستوں کے بت وغیرہ توڑ دیئے، اسکندریہ کا پیٹر یارک اٹھا، اور اپنے پیروؤں کو لے کر سراپیس کے ہیکل میں آیا، اس کو برباد کر دیا، اور جب پرستوں کے تمام معابد برباد کر چکا، تو کتب خانہ میں گیا، اور تمام کتابیں جلا دیں، یہاں تک کہ تمام الماریاں خالی ہو گئیں، اور کسی کو وہاں اس کے بعد حسرت و افسوس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا، جس شخص نے اس کتب خانہ کو جلایا، وہ پیٹر یارک تھیافلس ہے، جس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے اسکندریہ میں مسلمانوں کے داخل ہونے سے بہت پہلے برباد کر دیا تھا، اور یہ معلوم ہے، کہ مذہب اسلام میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے۔

۱۰ - ڈیون اپنی تصنیف "خرافات اہل یورپ" میں لکھتا ہے:۔

وہ دونوں کتب خانے جن کو بطلیموسیوں نے اسکندریہ میں قائم کیا تھا، سیزر کی فوج کے ہاتھ سے جو اس نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا تھا، جل گئے، لیکن اس جرم کی مکافات میں وہ کتب خانہ جس کو یومینز شاہ پرگامیس نے قائم کیا تھا، مارک انٹونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپٹرا کو ہدیۃً دیا گیا، لیکن زمانہ جہالت نے فیصلہ کر دیا تھا کہ عظیم الشان کتب خانہ چند صدی بھی نہ باقی رہے۔ پیٹر یارک تھیافلس نے ان کو جلا دیا۔

۱۱ - جان مبارک اپنی تصنیف "دعوا ہائے کاذبہ" میں کہتا ہے:۔

---

[1] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا، ج ۱، ص ۱۳۱۔ [2] برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا، ج ۱، ص ۴۹۴۔

"اہلِ یورپ نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلایا، اور مسلمانوں ہی نے علم یورپ میں پہنچایا۔

۱۲۔ مسٹر ملسلی اسٹیفونس اپنی تصنیف "خیال اور مذہب" میں لکھتے ہیں:۔

"کتب خانہ اسکندریہ جاہلوں کے ہاتھ سے برباد ہوگیا، اور اس عظیم الشان کتب خانہ کی بربادی سے علم برباد ہوگیا، اور یورپ جہالت کی تاریکیوں میں اس وقت تک بھٹکتا رہا، جب تک مسلمانوں نے اپنے علوم وفنون کی روشنی سے اس کو منور نہیں کیا۔

۱۳۔ ہنیس اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:۔

جولیس سیزر نے جب شہر اسکندریہ فتح کیا، تو پہلا کتب خانہ جل گیا، اور وہ دوسرا کتب خانہ جو اس کے بعد قائم کیا گیا تھا، باقی رہ گیا۔ اس کتب خانہ میں ان کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، جو مارک انٹونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپیٹرا کو ہدیۃً دی گئی تھیں، جس سے یہ کتب خانہ پہلے برباد شدہ کتب خانہ سے بڑا ہوگیا، اور ۳۹۰ء تک قائم رہا، جب کہ اہلِ یورپ نے بت پرستوں پر مظالم کئے، اور ان کے ہیکل منہدم کر دیئے، جن میں سراپیس کا ہیکل بھی تھا، تو کتب خانہ کو جلا دیا"۔

۱۴۔ جارج اپنی تصنیف "تریاق خرافات" میں دو جگہ لکھتا ہے:۔

"خبر ہے کتب خانہ اسکندریہ کیا ہوا؟ جواب دو کہ یورپ کی وحشی قوموں نے اس کو تھیوڈوسیس کے حکم سے ۳۹۰ء میں جلا دیا۔ یہ خاموش کتابیں زبانِ حال سے اس الزام کی تکذیب کر رہی ہیں، جو ردمیہ میں گڑھا گیا، کہ مسلمانوں نے عمرؓ کے حکم سے اس کو جلا دیا۔ عمرؓ کی طرف یہ جھوٹا انتساب بالکل بہتان اور افتراء ہے"۔

۱۵۔ جارج وایٹ اور جیمس اہلو لیر اپنی تصنیف "جرائم اہلِ یورپ" میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں

"تھیوڈوسیس نے فرقوریس کی تمام علمی کتابیں جلا دیں اور ان تمام کتابوں کے برباد کر دینے کا حکم دیا، جو مذہب کے مخالف ہوں۔ (پھر کہتا ہے)، اور جس نے کتب خانہ اسکندریہ جلایا، وہ تھیافلیس ہے، نہ مسلمان، کیونکہ مذہب میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے، علاوہ بریں تمام قدیم مورخین جو اسلام کے ابتدائی عہد میں تھے، انھوں نے کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے، باوجود اس کے انھوں نے نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان کیا ہے"۔

۱۶۔ بشپ جوزف اپنی کتاب "تاریخ شام" میں عام روایت کے بیان کرنے کے بعد ان الفاظ میں اپنی تحقیق ظاہر کرتا ہے[1]:۔

"اس قصہ کی بہت سے عیسائی، اور بعض مسلمان مورخین نے روایت کی ہے، لیکن محققین اسکو صحیح نہیں سمجھتے"

۱۷۔ اس سلسلہ کی سب سے مقدم اور سب سے بڑی شہادت، اسپین کے مورخ اوروسئس کی عینی شہادت ہے، جس کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا ہے، شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے تھیافلیس جب کتب خانہ کو برباد کرچکا تھا اس کے بیس برس کے بعد اوروسئس نے کتب خانہ کی عمارت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ "میں نے اس وقت کتب خانہ میں صرف خالی الماریاں دیکھی تھیں، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمانوں سے مدتوں پہلے یہ علمی یادگاریں خود عیسائیوں کے تعصب مذہبی کی نذر ہوچکی تھیں،

ان شہادتوں کے بعد جو خود اہلِ یورپ کی زبانوں سے نکلی ہیں، اس امر میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ مسلمان اس الزام سے بالکل بری ہیں، جو بعض کوتاہ نظر متعصب اہلِ یورپ ان پر لگانا چاہتے ہیں، حضرت الاستاذ نے اپنے مضمون کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ امید ہے کہ وہ دن بھی آئے، جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہوکر علانیہ کہدے، کہ

ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا،

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ آگیا جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہوکر علانیہ کہہ اٹھا،

ع ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا،

(الندوہ اگست ۱۹۱۰ء)

(۲)

کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق نفیاً اور اثباتاً ہر پہلو سے اس قدر بحثیں ہوچکی ہیں، کہ بظاہر اب کوئی نیا پہلو بحث کا نظر نہیں آتا، لیکن ایک انگریز اہل قلم نے اس مسئلہ کے ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھایا ہے، جس کی طرف کسی مخالف یا موافق کی نظر اب تک نہیں اٹھی، کتب خانہ اسکندریہ کی جو داستان تصنیف ہوئی ہے، اس کے ہیرو کا نام یحیٰ نحوی ہے، یحیٰ نحوی ہی حضرت عمرو بن العاص کی خدمت میں آتا ہے، وہی ان سے کتب خانہ کی تاریخ بیان کرتا ہے،

[1] نمبر ۹ سے لےکر ۱۶ نمبر تک کے حوالوں کے لئے دیکھئے رسالہ المقتبس، ج ۴، ص ۷۵ و ۷۶۔

حضرت عمرؓو بن العاص، حضرت عمرؓ بن خطاب سے اس کتب خانہ کے بارے میں حکم چاہتے ہیں، حضرت عمرؓ اس کو جلادینے کا حکم دیدیتے ہیں، اور اسکندریہ کا یہ قدیم اور نایاب کتب خانہ اسکندریہ کے حماموں میں چھ مہینے تک آگ سلگانے کے کام میں آتا ہے، اب تک اس قصہ کی تردید وتکذیب میں جن یورپین اور مسلمان مورخین نے جو دلائل قائم کئے ہیں، ان سب میں یہ مسلم تھا کہ یحیٰ نحوی اس عہد میں موجود تھا، اور وہی اس قصہ کا ہیرو قرار پاتا ہے، لیکن مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں جہاں اسکندریہ کا ذکر کیا ہے وہاں کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے یہ کتب خانہ برباد ہوچکا تھا، اور سب سے بڑی دلیل یہ قائم کی ہے، کہ اس روایت کے (جس میں عربوں کے ہاتھ سے کتب خانہ کا برباد بیان کیا گیا ہے) وضعی اور جعلی ہونے پر سب سے زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ اس روایت کا ہیرو یعنی یحیٰ نحوی کا اس عہد میں وجود تاریخی اسناد کے بالکل مخالف ہے، اگر وہ اس عہد میں موجود ہوتا تو اس کی عمر ۱۳۰ برس سے بہت زیادہ تسلیم کرنی پڑے گی،

مسٹر بٹلر نے ۲۵ر جون ۱۹۱۱ء کے ٹائمز میں اس مضمون کی خوب دھجی اڑائی ہے، لکھا ہے کہ،

"نہایت تعجب کی بات ہے کہ لوگ پھر اس واقعہ کو از سرنو دہرارہے ہیں، کہ عمر نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلادیا، اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین ٹائمز جیسے وقیع اخبار میں شائع ہوں، میں سمجھتا ہوں، کہ مضمون نگار نے اس مسئلہ پر علمی اور تاریخی پہلوؤں سے غور نہیں کیا ہے، اور اگر کرتا تو اس کو معلوم ہوجاتا کہ جن چیزوں کو وہ جدید دلائل سمجھ رہا ہے، وہ اس موضوع کی پیش پا افتادہ باتیں ہیں، جن پر اس مسئلہ کی تحقیق میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا،

میں نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں اس بحث کے متعلق ایک خاص باب قائم کیا ہے، جس میں واضح دلائل سے حسب ذیل نتائج منتج کئے گئے ہیں،

۱۔ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ فتح مصر کے پانچسو برس کے بعد یورپین تصنیفات میں شائع کیا گیا ہے، اس کی اشاعت کرنے والے عبد اللطیف بغدادی، جمال الدین قفطی، ابو الفدا، اور مقریزی ہیں، اور اس میں بھی شک نہیں کہ ابو الفرج نے اپنی روایت عبد اللطیف سے حاصل کی ہے، یہ تحقیق کوئی جدید نہیں ہے، بلکہ پہلے سے مشہور، معروف اور متداول ہے،

۲۔ اس واقعہ کے متعلقات جو بیان ہوتے ہیں،

۳۔ اس واقعہ کا ہیرو یوحنا نحوی فیلیو نس بے، جو عربوں کے مصر فتح کرنے سے پہلے مر چکا تھا۔

۴۔ اسکندریہ میں دو مشہور عالیشان کتب خانے تھے، ایک جانب خانہ کا کتب خانہ اور دوسرا سیرا پیم کا کتب خانہ اس واقعہ میں کتب خانہ کا نام لیا جاتا ہے، وہ انہی دونوں کتب خانوں میں سے کوئی ایک ہوگا، لیکن پہلا کتب خانہ [illegible] کے معرکہ میں مسلمانوں کے فتح مصر سے چار سو برس پہلے برباد ہو چکا ہے، دوسرے کتب خانہ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ۳۹۱ء میں وہ دوسری جگہ منتقل ہو گیا تھا یا اسی سنہ میں وہ تلف ہو گیا، اس بنا پر ۶۴۲ء میں یعنی مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے وقت اسکندریہ میں کسی کتب خانہ کا وجود نہ تھا، پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی کی تصنیفات میں اسکندریہ کے کسی کتب خانہ کا ذکر نہیں ہے،

(۵) اگر کتب خانہ فتح اسکندریہ کے وقت وہاں موجود تھا، تو اس کو اس زمانۂ صلح میں جو اسکندریہ کو مسلمانوں کے سپرد کر دینے سے پہلے، رومیوں کو از روئے معاہدہ دوسری جگہ منتقل کرنا آسان تھا، کیونکہ معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بیش قیمت چیزیں رومی اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں، دریا کا راستہ اس زمانہ میں بالکل کھلا ہوا تھا۔

۶۔ اگر بالفرض یہ کتب خانہ دوسری جگہ منتقل ہوتا یا برباد کر دیا جاتا، تو اس زمانہ کا مشہور مورخ فیلیو اس واقعہ کے ذکر سے خاموش نہ رہتا۔

ان وجوہ کی بنا پر اڈیٹر الہلال نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، جو نئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی اور بیری بات ہے، اور مضمون نگار نے آپ کے اخبار کے کالموں میں اپنی جہالت کے ثبوت کے علاوہ کوئی تاریخی دلیل نہیں پیش کی، جس سے واقعہ کا ثبوت ہو۔

مسٹر بٹلر کی تحقیقات جہاں تک پہنچی ہے، ان میں یحیٰ نحوی کے زمانۂ وجود کے علاوہ اور تمام باتیں اس سے پہلے بدلائل بار بار ثابت کی جا چکی ہیں، ہم مسٹر بٹلر کے ان دلائل سے واقف نہیں ہیں، جن سے انہوں نے زمانۂ فتح مصر میں یحیٰ کے موجود نہ رہنے پر استدلال کیا ہے، یحیٰ کا جن عربی تصنیفات میں ذکر ہے، وہ سب ایک ایک کر کے نظر کے سامنے تھیں، اور متعدد بار پڑھی بھی جا چکی تھیں، لیکن کبھی یحیٰ کے زمانۂ وجود کی تحقیق کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا، لیکن مسٹر بٹلر کے مضمون کے بعد ابن الندیم کی الفہرست میں وہ عبارت بغور پڑھی، جو یحیٰ کے متعلق ہے، تو معلوم ہوا کہ چوتھی صدی کے مورخ ابن الندیم کو بھی عربوں کے فتح مصر کے وقت یحیٰ کے وجود پر اعتراض تھا

(الندوہ دسمبر ۱۹۱۱ء)

مخالفین اسلام

اور

جزیہ

جزیہ

مخالفین اسلام نے جہاں اسلام پر اور بہت سے غلط الزامات قائم کئے ہیں، وہاں ایک الزام یہ بھی ہے، کہ مسلمان ذمیوں پر یعنی اپنی غیر مذہب رعایا پر ایک مذہبی ٹیکس لگاتے تھے جس کو جزیہ کہتے ہیں، یہ رقم غیر مسلمانوں سے ان کی تحقیر کے لئے وصول کی جاتی تھی، مارسڈن صاحب اپنی انگریزی تصنیف ہسٹری آف انڈیا میں جو ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں کی جونیر کلاسوں میں پڑھائی جاتی ہے، عالمگیر کے حال میں لکھتے ہیں:-

"عالمگیر نے ایک مرتبہ سے زیادہ اس قابل نفرت جزیہ یعنی مذہبی ٹیکس کو جاری کیا، جو اکبر کے عہد سے موقوف کر دیا گیا تھا۔ (ص ۱۸۱، فقرہ ۴)

ہم کو اکبر اور عالمگیر سے بحث نہیں ہے، اور نہ اس وقت اس سے بحث ہے، کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جن پر ہندو مسلمان دونوں برابر کا استحقاق رکھتے ہیں، ایسی کتابیں تاریخ کے نصاب میں کیوں داخل کی جاتی ہیں، جن میں کسی فریق کے متعلق دلآزار فقرے درج ہوں، اس وقت ہمارا روئے سخن ان معترضین اسلام کی طرف ہے، جن کو اسلامی تصنیفات کا تو کیا ذکر، اپنے ہم مذہب[1] اہل قلم محقق کی تحقیقات کی بھی خبر نہیں، اور اکثر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل جاتا ہے، کہ "جزیہ یعنی مذہبی ٹیکس"،

حضرت الاستاذ (مولانا شبلی) نے ایک مدت ہوئی، ایک مضمون کے ذریعہ سے اس اعتراض کی اچھی

---

[1] دیکھو ڈاکٹر ہوا خر روتی مسیحی کی عربی و انگریزی ڈکشنری، لفظ جزیہ۔

طرح پردہ دری کر دی تھی، اور وہ مضمون "الجزیہ" کے نام سے اردو، انگریزی اور عربی زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ مصر کے نامور مذہبی رسالہ المنار نے اس مضمون کو تمام و کمال اپنے صفحات میں شائع کر دیا ہے، اس مضمون میں تاریخی واقعات سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ "جزیہ" ایک فوجی ٹیکس تھا، جو صرف ان غیر مسلمانوں سے لیا جاتا تھا، جو اسلامی فوج میں شریک ہو کر ملک و وطن کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں قبول کرتے تھے، گویا وہ یہ رقم اپنی حفاظت کے معاوضہ میں حکومت کو ادا کرتے تھے، غیر مسلمانوں نے جب کبھی بھی مسلمانوں کی طرح فوجی فرائض ادا کرنا چاہا ہے، وہ اس ٹیکس سے معاف کر دیئے گئے ہیں،

مولانا شبلی کے اس مدلل مضمون کے بعد اس مسئلہ پر پھر قلم اٹھانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن یورپ کی کوشش سے ہمارا قدیم علمی، مذہبی اور ادبی ذخیرہ منظر عام پر آتا جاتا ہے، اسلام کا چہرہ روشن ہوتا جاتا ہے اور اس کی بے گناہی کے ثبوت کے نئے نئے اسباب پیدا ہوتے جاتے ہیں،

یورپ کے مستشرقین نے اپنی محنت، کوشش، جانفشانی اور جانکاہی سے ابتدائی ہجری صدیوں کے خطوط، مکاتیب اور فرامین کا پتہ لگایا ہے، تاریخی کتابوں کی مدد سے ان کے کاتب اور مکتوب الیہ کے نام اور ان کے زمانے دریافت کئے ہیں، عربی کے قدیم املا اور نشان خط کو، جو موجودہ املا اور نشان خط سے بالکل مختلف ہے، نہایت محنت اور عرق ریزی سے پڑھا ہے، ان کے محو شدہ اور کرم خوردہ الفاظ اور فقروں کی تصحیح کی ہے اور ایک مجموعہ کی صورت میں ان کے فوٹو شائع کئے ہیں، اس قسم کے دو مجموعوں کا ہم کو پتہ چلا ہے، ایک مجموعہ ہیڈل برگ میں مستشرق بیکر اور دوسرا انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر مارگیولیتھ کی کوششوں سے شائع ہوئے، پہلے مجموعہ کی قیمت تقریباً ایک ہزار روپیہ ہے،

اس مجموعہ میں قرہ بن شریک کا ایک خط بسیل کے نام ہے، قرہ ۱۰۲۹ھ میں ولید کے عہد میں مصر کا افسر صیغۂ مال تھا، بسیل بہ قرائن ایک قبطی رئیس یا زمیندار کا نام ہے، جو اشقوہ کی ریاست کا مالک تھا، قرہ نے اس خط میں بسیل سے زر جزیہ طلب کیا ہے، یہ زر جزیہ کیوں طلب کیا ہے، اور یہ کس مصرف میں آئے گا، اس کا جواب خود خط کی خاموش زبان دے گی۔

خط

١ـ بسم الله الرحمن الرحیم	١ـ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
٢ـ من قرة بن شریک الی بسیل	٢ـ قرہ بن شریک کی جانب سے بسیل کے نام
٣ـ صحب شقوہ فانی احمد	٣ـ رئیس شقوہ میں حمد کرتا ہوں۔
٤ـ الله الذی لا اله الا هو	٤ـ اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں
٥ـ اما بعد فانه قد ذهب	٥ـ بعد ازیں اتنا زمانہ گذر گیا۔
٦ـ من الزمن ما قد علمت	٦ـ جو تم جانتے ہو،
٧ـ وقد استاخرت الجزیة	٧ـ اور فوجیوں کی تنخواہ میں دیر ہوگئی۔
٨ـ وحضر عطاء الجند	٨ـ اور فوج کی تنخواہ اور
٩ـ وعطاء عیالهم وخروج الجیوش	٩ـ فوج کے اہل وعیال کی تنخواہ اور لشکر کے نکلنے کا۔
١٠ـ انشاء الله فاذا جاءك	١٠ـ خدا نے چاہا تو زمانہ آگیا جب تم کو
١١ـ کتابی هذا فخذ فیما علیٰ ارضك	١١ـ میرا یہ خط پہنچے،
١٢ـ من الجزیة وعجل بالاول	١٢ـ جس قدر جزیہ ہو، وصول کرو اور پہلی پھر
١٣ـ فالاول مما جمعت	١٣ـ دوسری قسط جمع کروہ جزیہ میں سے جلد بھیجو۔
١٤ـ ولا اعرفن علیٰ ما اخرت	١٤ـ میں یہ نہیں معلوم کروں گا، کہ تم نے کیوں دیر کی،
١٥ـ وما قبلك ولا کان له حبس	١٥ـ اور تم کو کیا پیش آیا، اور نہ جزیہ کی قسط روکو۔
١٦ـ فان اهل ارضك	١٦ـ کیونکہ تمھاری رعایا،
١٧ـ قد فرغوا من زراعتهم	١٧ـ کاشتکاری سے فارغ ہو چکی۔
١٨ـ (ثم ان) الله معینهم علیٰ	١٨ـ (پھر بیشک) خدا ان کا امیر المومنین
١٩ـ ما کان علیهم من حق امیر	١٩ـ کا حق ادا کرنے میں مددگار ہے۔
٢٠ـ المومنین فلا یکونن فی امرك	٢٠ـ اس لئے تمھارے کام میں
٢١ـ عجز ولا تاخیر ولا،	٢١ـ عذر اور تاخیر نہ ہو۔

۲۲ - تحبسا بما قبلك فانه ذ	۲۲۔ جو تمہارے پاس جمع ہو جائے اس کو روکو کیونکہ اگر
۲۳ - قد اجتمع عندی مال	۲۳۔ ... میرے پاس کچھ روپیہ جمع ہو جاتا.
۲۴ - قد اعطیت الجند	۲۴۔ تو میں فوج کو اس کی تنخواہ.
۲۵ - عطاهم انشاء الله فاکتب	۲۵۔ انشاء اللہ دیدیتا. مجھ کو لکھو.
۲۶ - الی بما اجتمع عندك	۲۶۔ کہ جزیہ جو تم نے وصول کیا. اس میں
۲۷ - ماجبیت من الجزیة	۲۷۔ کیا تمہارے پاس جمع ہوا.
۲۸ - وکیف فعلت فی ذالك	۲۸۔ اور تم نے اس بارہ میں کیا کیا.
۲۹ - والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ	۲۹۔ جو لوگ ہدایت کی پیروی کریں ان پر سلام
۳۰ - وکتب حریر[1] فی شهر ربیع	۳۰۔ اور جریر نے ماہ ربیع الاول
۳۱ - الاول سنة احدی وتسعین	۳۱۔ سنہ ۹۱ھ میں لکھا.

اس خط سے بالکل روشن ہو جاتا ہے، کہ اسلام میں جزیہ کوئی مذہبی ٹیکس نہیں، بلکہ فوجی ٹیکس تھا، اور آج بھی ترکوں نے ان غیر اسلامی قوموں سے جنھوں نے فوجی خدمت قبول کر لی ہے، جزیہ موقوف کر دیا ہے۔ —

فبای حدیث بعدہ یومنون.

---

[1] جریر میر منشی یا ہیڈ کلرک کا نام ہے، خطوں میں حمد و نعت اور آداب و القاب کا اختصار اور انشاء اللہ کا التزام قدماء کا خاص طرز ہے۔ (الندوہ، اگست سنہ ۱۹۱۱ء، مطابق شعبان سنہ ۱۳۲۹ھ،)

۱۸۰۰ء سے پہلے
کے
مستشرقین یورپ

مستشرق جن کو اہل یورپ اورنٹیلسٹ کہتے ہیں، ان سے مراد وہ یورپین علماء ہیں، جن کو مشرقی علوم و فنون سے واقفیت ہے۔ جو مشرقی تہذیب و تمدن، مشرقی لٹریچر اور مشرقی اقوام کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مشرق کا لفظ گو تمام ایشیا اور افریقہ کو شامل ہے لیکن علمی حیثیت سے مستشرقین نے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی وسعت اور قدامت کے لحاظ سے زیادہ تر مردہ اقوام میں فنیشین، کلدانی، اہل بابل و نینوی، سریان اور عرب جاہلیت اور زندہ اقوام میں عرب اسلام اہل فارس، و اہل ہند اور اہل چین سے بحث کی ہے۔ انھوں نے مردہ اقوام کی گم شدہ تاریخوں کی جستجو کی۔ ان کے ویران و بے نشان یادگاروں کا پتہ لگایا۔ ان کے منہدم اور بوسیدہ کھنڈروں کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر کا تاریخ کا ایک ایک صفحہ سمجھ کر مطالعہ کیا۔ ان کے مسکن اور جائے اقامت کو کھود کھود کر اس میں سے ایک ایک ذرہ نکالا۔ ان کی غیر مفہوم کتابوں کو بدقت تمام پڑھا۔ ان کے قدیم رسوم و رواج، ان کی زبان اور ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا اور ان سے نتائج پیدا کئے۔ اور اس طرح ان مردہ اور گم شدہ اقوام کی ایک مسلسل تاریخ کا سرمایہ بہم پہنچایا۔ زندہ اقوام کی تاریخ کو پڑھا، ان کی نادر تصنیفات کو بہم پہنچایا، ان کا مطالعہ کیا۔ ان کے ایجادات و اکتشافات سے واقفیت حاصل کی۔ ان کی تاریخی عظمت کو تسلیم کیا۔ ان کے علوم و فنون کو ترقی دی۔ ان کے تہذیب و تمدن کی تاریخ مدون کی۔ ان کے لٹریچر کی ترقی اور توسیع میں کوشش کی۔ ان کی نایاب تصانیف کو محفوظ کیا۔ ان کو مرتب کیا، ان کی تصحیح کی، اور ان کو چھاپ کر شائقین کے لئے وقف عام کیا۔

ہم کو اس وقت تمام مستشرقین میں سے صرف ان لوگوں کا تذکرہ مقصود ہے جنہوں نے اسلام اور عربی لٹریچر کے تحفظ و ترقی میں کوشش کی ہے۔ ان دو کے چند نمبروں میں حسب تقاضائے موقع گو ان کی بعض کوششوں کا ذکر ہو چکا ہے لیکن تاہم یہ بزرگ مستشرقین یورپ نے اسلام اور عربیت پر جو بے انتہا احسانات کئے ہیں ان کے شکریہ کا بار ان چند مختصر صفحات سے نہیں ادا ہو سکتا۔ اس لئے ذیل کے چند مسلسل نمبروں میں ہم ان کے احسانات کے اعتراف میں ان کے کارناموں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے اس مضمون کا ماخذ ایک عربی زبان کی جدید تصنیف "عربی لٹریچر کی تاریخ انیسویں صدی میں" ہے۔

۱۸۰۰ء سے پہلے

یہ بات بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ اسلام اور یورپ کا تعارف اول اول اسپین، جنوبی فرانس اور سسلی وغیرہ ملکوں میں ہوا۔ اس تعارف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یورپ کو اپنے ہمسایہ متمدن یافتہ قوم سے تحصیل علوم و فنون کا موقع ہاتھ آیا۔ موجودہ انقلاب سے پہلے یورپ عربی علوم و فنون کی تحصیل استفادہ کرتا تھا۔ اور اب افادہ کرتا ہے۔ یورپ کے موجودہ انقلاب کی تاریخ ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے یورپ میں ان علوم کا علم ہم بارہویں صدی عیسوی میں پاتے ہیں۔ یورپ میں اس زمانے کا سب سے پہلا واقف علوم دیر کلونی کا بشپ پطرس Pierre (سنہ ولادت ۱۰۹۲ء، سنہ وفات ۱۱۵۶ء) تھا۔ پطرس نے اسپین کی سیاحت کی تھی۔ اور اس نے عربوں کے تہذیب و تمدن کا تماشہ وہاں دیکھا تھا۔ سیاحت سے واپس آکر اس نے عربی تصنیفات کے ساتھ خاص توجہ کی۔ اسی زمانے میں ایک اور شخص گیرارڈ کریمونی Gerard Cremona (۱۱۱۴ء - ۱۱۸۰ء) پیدا ہوا۔ جو عربی زبان سے کامل واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے رازی اور ابن سینا وغیرہ مشہور حکمائے عرب کی تصنیفات میں تقریباً ساٹھ گراں پایہ تصانیف کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتابیں تمام تر ریاضی، طب، ہیئت، اور فلسفہ کی تھیں۔ جن میں سے آج بعض چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور اکثر ناپید ہیں۔

اس صدی میں سینٹ ڈومینک اور سینٹ فرانسس کی خانقاہیں جب قائم ہوئیں، تو وہاں کی جماعت میں متعدد لوگ ایسے تھے جو السنۂ مشرقیہ کی تحصیل میں مشغول رہتے تھے۔ ڈومینک کی خانقاہ کا مشہور عالم البرٹ اعظم

(۱) الآداب العربیۃ فی القرن التاسع عشر للاب لویس شیخو۔

Albert ۱۱۹۳ء تا ۱۲۱۵ء جب پیرس کے کالج میں ارسطو کی تصنیفات کا درس دیتا تھا، تو فارابی ابن سینا، اور غزالی کی کتابوں سے استناد کرتا تھا۔ اس طرح ڈومنیک کی خانقاہ کا ایک دراہپنی عالم ریمنڈ لول Reymond Lole (۱۲۳۵ء۔ ۱۳۱۵ء) یورپ کے مدارس میں مشرقی زبانوں کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ ۱۲۵۵ء سے ڈومنیک کی خانقاہ کے راہبوں نے ایک منظم اور باقاعدہ مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی، جس میں سریانی، عبرانی اور عربی کی تعلیم دی جائے۔

فرانسیس کی خانقاہوں کے راہب بھی علوم مشرقیہ سے کم دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے طلبہ کی ایک معقول تعداد عربی زبان کی تحصیل کے لئے خاص کردی تھی۔ ان میں سے ایک مشہور شخص میجل اسکاٹ M. Scot ہے جس نے ۱۲۱۷ء میں طلیطلہ (ٹالیڈو واقع اسپین) میں عربی زبان کی تکمیل کی، اور بہت سی عربی تصانیف کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا، اس سے زیادہ مشہور انگریز راہب راجرس بیکن R. Bacon ہے۔ جو الٰہیات اور طبیعیات میں یگانۂ روزگار تھا۔ اس نے السنۂ مشرقیہ کی اشاعت میں عموماً اور عربی زبان کی اشاعت میں خصوصاً تا امکان بہت کوشش کی۔

رومن پوپوں نے سامی زبانوں کی توسیع و اشاعت میں جس میں عربی زبان بھی داخل ہے۔ تمام شاہان یورپ سے زیادہ اہتمام کیا۔ قابل ذکر واقعات میں سے ایک یہ واقعہ ہے، کہ پوپ ہنری چہارم نے ابتدائی چودھویں صدی میں پیرس میں ایک عربی مدرسہ قائم کرنا چاہا تھا۔ وائنا میں جب ۱۳۱۱ء میں مجلس منعقد ہوئی، تو اس کی ایک یہ تجویز بھی تھی کہ عبرانی، کلدانی اور عربی زبان کی درسگاہیں رومیہ میں پوپ کے مصارف سے اور پیرس میں شاہ فرانس کی اعانت سے اور پولینڈ، آکسفورڈ، و رسلامنکا میں بشپ اور پادریوں کی امداد سے قائم کی جائیں، ان قطعی الشہادت دلائل میں سے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان پیرس کے کالج میں تعلیم ہوتی تھی، پوپ جان بست ددوم کا ایک فرمان مرقومہ ۱۳۲۵ء ہے جس میں اس نے اپنے پیرس کے نائب کو تاکید کی ہے۔ کہ وہ کالج کے عربی صیغہ کی نگرانی کرے۔

علمی حیثیت کے علاوہ نیز مذہبی حیثیت سے پادریوں اور مشنریوں کو عربی جاننے کی ضرورت تھی، اس لئے یورپ میں عربی زبان کی توسیع مشنریوں اور پادریوں کی کوشش سے بھی ہوئی، ان تمام

کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب علمائے زبان عربی یورپ کے ہر حصہ میں موجود ہیں۔ یورپ کے کتب خانے عربی کی نادر تصنیفات سے مالامال ہیں خصوصاً پیرس پایہ تخت فرانس، میڈرڈ پایہ تخت اسپین، لیڈن واقع ہولینڈ، آکسفورڈ واقع انگلینڈ، اور لنڈن پایہ تخت انگلینڈ کی لائبریریاں عربی کی علمی یادگاروں سے معمور ہیں۔

۱۸۰۰ء سے پہلے یورپ میں عربی زبان کے متعلق جو کوششیں ظہور پذیر ہوئیں۔ ۱۸۸۰ء تک
وہ یا تو شخصی تھیں یا مذہبی اثر سے تھیں۔ تمام ممالک یورپ میں فرانس سب سے پہلا ملک ہے جس کو مستشرقین کے مورد اول ہونے کا شرف حاصل ہے اور جہاں عربی علوم و فنون کے متعلق باقاعدہ اور منظم کوشش شروع ہوئی۔ ارکان حکومت فرانس نے ۱۷۹۵ء میں زندہ السنۂ مشرقیہ یعنی عربی، فارسی اور ترکی کی تعلیم کے لئے ایک درسگاہ قائم کی، یہ درسگاہ تمام یورپ کے مدارس مشرقیہ کے لئے نمونہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد ممالک یورپ کے جن مشہور شہروں میں مشرقی مدارس قائم ہوئے۔ وہ اسی طرز پر قائم ہوئے۔ پیرس کی یہ عظیم الشان مشرقی درسگاہ اب تک روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اس درسگاہ سے فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کے بے شمار لوگ السنۂ مشرقیہ کی تعلیم پا کر نکلے۔ جن میں بعض مشہور اشخاص کا ہم آئندہ تذکرہ کریں گے۔

۱۸۹۵ء میں یعنی آج سے سولہ برس پہلے اس درسگاہ کی یک صدی جوبلی کی تقریب سے نہایت اہتمام سے عید منائی گئی تھی، اس جوبلی کی یادگار میں، اس درسگاہ کے پروفیسروں اور طلبہ کے قلم سے مشرقی علوم و تہذیب کے متعلق بعض مفید رسالے نکلے، اس مدرسۂ مشرقیہ نے اب اپنے تعلیمی کورس میں مشرق اقصیٰ یعنی چین، جاپان اور انام کی زبانیں اور ارمنی اور اردو زبان بھی داخل کر لی ہے، جو یورپین مشرقی ملک میں کونسلی یا سفارت کے عہدے کے خواہش مند ہیں وہ یہیں تعلیم پاتے ہیں۔

اس درسگاہ کے قائم کرنے میں سب سے زیادہ کوشاں دو شخص تھے۔ پہلا سلوسٹر ڈی ساسی ہے جس کو حکومت سے بیرن اور قوم سے مستشرق اعظم کا خطاب ملا ہے۔ (ساسی کا ذکر آگے آتا ہے)۔ دوسرا شخص لوئی لنگلے S.M Langlès (۱۷۶۳ء - ۱۸۲۴ء) ہے، جو ہندوستانی زبانوں کا پروفیسر تھا۔ ان زبانوں میں اس کی مفید تصنیفات بھی ہیں۔ جو چھپ چکی ہیں۔ لنگلے نے مصر، شام اور فلسطین کی

سیاحت بھی کی تھی۔ اور اسکا سفرنامہ بھی لکھا تھا۔ جو ۱۷۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے انتہائی حصہ میں اورینٹل لٹریچر کی اشاعت یورپ میں جن اسباب سے ہوئی۔ ان میں سب سے بڑا ایشیاٹک سوسائیٹیز کا وجود ہے، سب سے پہلے ایشیاٹک سوسائٹی ۱۷۷۸ء میں جزائر ہند مقبوضہ ہالینڈ کے شہر بٹیویا میں قائم ہوئی۔ لیکن اس سوسائیٹی کی کوشش زیادہ تر ہالینڈ کے مقبوضہ ایشیائی ممالک تک محدود تھیں، اس کے بعد اس قسم کی دوسری سوسائٹی ۱۷۸۴ء میں ایک انگریز سر ولیم جانس (۱۷۴۳ء۔ ۱۷۹۵ء) نے بنام جنرل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ یہ سوسائٹی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ اس سوسائٹی کا بانی سر ولیم ممتاز مستشرقین میں تھا۔ مشرقی علوم میں اس کی متعدد تالیفیں ہیں۔ جن میں سے ایک انگریزی زبان میں سبعہ معلقہ کی شرح ہے۔ اس سوسائٹی کے نمونہ پر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ہے جو ۱۷۸۴ء میں قائم ہوئی۔ گو ان اٹھارہویں صدی کی سوسائیٹیوں کا مبلغ کوشش انیسویں صدی کی سوسائیٹیوں تک نہیں پہنچا ہے لیکن پھر بھی ان کے اہتمام سے عربی اور فارسی زبان کی بہت سی ادبی، صناعی، تاریخی، علمی اور مذہبی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ اور اب تک ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپ چھپ کر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اب تک اجمالی حیثیت سے یورپ کے مستشرقین کا بیان تھا، اب ہم ہر ملک کے مستشرقین کا بقید ملک تذکرہ کرتے ہیں۔ ان مستشرقین میں سے جنھوں نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر مختلف ممالک یورپ میں شہرت حاصل کی ہے، حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

<u>فرانس</u> | فرانس میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں جوزف ڈی گینے J. de Guignes (۱۷۲۱ء۔ ۱۸۰۰ء) ایک مشہور اورنٹیلسٹ تھا۔ یہ پیرس کی علمی درسگاہ میں سریانی زبان کا معلم تھا۔ اس نے تاتاریوں، مغلوں اور ترکوں کی تاریخ پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے۔ اس کا ہم عصر انکیوٹل ڈوپران (Anquetil Duperron ۱۷۳۱ء۔ ۱۸۰۵ء) ہے، ڈوپران ابھی نوجوان ہی تھا، کہ السنہ مشرقیہ کا پروفیسر ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے مشرقی ممالک کی سیاحت کی۔ ہندوستان کی قلمی نادر کتابیں جمع کیں۔ اور

متعدد تصنیفات اہل ہند، اہل فارس اور عربوں کے متعلق شائع کیں، یہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے زردشت کی مشہور تصنیف ژند اوستا اور بودھ کی بعض کتابوں کا ترجمہ فرنچ میں کیا۔ تیسرا فرانسیسی مستشرق ہربن A. Herbon (۱۷۸۳ء۔ ۱۸۰۶ء) ہے، اس نوجوان مستشرق نے عربی زبان کے لغات کی اصل پر ایک کتاب لکھی۔ اور دو ڈکشنریاں ترتیب دیں۔ ایک عربی سے فرنچ میں ہے، اور دوسری فرنچ سے عربی میں، قدیم عربوں کے فن موسیقی اور اہل فارس کے لٹریچر پر بھی اس نے مضامین لکھے ہیں۔

ہربن سے دس برس پہلے ایک اور مستشرق کی تاریخ وفات ہے جس کا نام جان جاک برٹلمی J. J. Barthelemy (۱۷۱۶ء۔ ۱۷۹۵ء) تھا۔ اس نے فنیشین اور تدمری عربوں کی قدیم یادگاروں کے متعلق مفید تحقیقات کی ہیں۔

فرانسیسیوں کو مشرقی لٹریچر کے ساتھ جو دلچسپی تھی، نپولین کے واقعۂ فتح مصر سے اس میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ نپولین ۱۷۹۸ء میں جب مصر کے قصد سے روانہ ہوا، تو اس نے مشہور مستشرقین کو بھی اپنے ساتھ لے لیا ان مستشرقین نے عربی زبان کی تحصیل کی، اور جب وہ مصر سے اپنے وطن فرانس واپس آئے، تو انھوں نے عربی زبان کو اپنے وطن میں خوب پھیلایا۔

جرمنی | اٹھارہویں صدی کے اس آخر میں جرمنی میں بھی عربی داں مستشرقین موجود تھے، جو ہمہ تن عربی لٹریچر کی ترقی و اشاعت میں مشغول تھے۔ ان میں سے پہلا شخص جان جاک ریسکہ J. J. Reiske (۱۷۱۶ء۔ ۱۷۷۴ء) ہے اس نے عربی تصنیفات کا ایک معتد بہ حصہ چھاپ کر شائع کیا۔ مقامات حریری، تاریخ ابوالفدا، اور معلقہ طرفہ وغیرہ کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اور ان پر حواشی لکھے۔ اس کے بعد جان ڈیوڈ میکائیل J. D. Michaelis (۱۷۱۷ء۔ ۱۷۹۰ء) پیدا ہوا۔ یہ گوٹنگن میں سامی زبانوں کا معلم تھا اس نے عبرانی، سریانی اور عربی زبانوں میں بہت سی مفید تصنیفات لکھیں۔ ان میں سے ایک تصنیف سامی زبانوں کے اصول ادبیات کے متعلق ہے۔ تیسرا جرمن مستشرق تھیکسن ہے۔ اس کی مشرقی تصنیفات میں سے ایک مستقل تصنیف اسلامی سکول کے متعلق ہے۔

سوئٹزرلینڈ | اسی زمانہ میں سوئٹزرلینڈ کی خاک سے ایک بہت بڑا مستشرق اٹھا ہے۔ اس کا نام برکھارڈ

J. L. Berckhard (۱۷۸۴ء - ۱۸۱۷ء) ہے اس نے مسلمان بن کر یا مسلمان ہوکر نوبہ، شام اور حجاز کا سفر کیا، اور ان ملکوں میں شیخ ابراہیم برکات کے نام سے مشہور ہوا، قاہرہ میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہے۔ اس کی قبر قاہرہ میں عوام کے نزدیک ایک مسلمان درویش کے مزار کی حیثیت رکھتی ہے اس نے شام مصر اور عرب ملکوں میں اپنے سفر کے حالات مدون کئے ہیں۔ اس کی ایک تصنیف عربی ضرب الامثال کے متعلق بھی موجود ہے۔

انگلینڈ | اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر انگلینڈ میں بھی عربی زبان نہایت احترام اور عزت سے دیکھی جاتی تھی، کیمبرج اور اوکسفورڈ کی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی مکمل تعلیم ہوتی تھی، اٹھارہویں صدی سے پہلے ہی اکسفورڈ میں عربی کا ایک مطبع قائم تھا، جو بہت مشہور رہا، اس مطبع سے بہت سی عربی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ ان میں سے اڈورڈ پوکاک (۱۶۰۴ء - ۱۶۹۱ء) اور اس کے بیٹے ٹامس کی مرتبہ کتابیں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ اڈورڈ نے مشرق کا سفر کیا تھا۔ حلب میں وہ ایک مدت تک مقیم تھا۔ اوکسفورڈ میں اس نے کچھ دنوں پروفیسری بھی کی تھی، ابوالفرج ابن العبری ملطی اور سعید بن بطریق کی تاریخیں اسی کے اہتمام سے شائع ہوئیں۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر انگلینڈ میں مشرقیات یعنی مشرقی علوم و فنون کا ایک ماہر پیدا ہوا۔ جس کا نام کارلایل J. D. Carlyle (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۴ء) تھا۔ اس نے مشرقی ممالک کی سیاحت کی تھی۔ اس کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر ہو گیا تھا، عربی کی شاعری اور ادبیات پر اس کی تصنیف بھی ہے۔ جمال الدین ابن تغری بردی کی کتاب مورد اللطافت کا ایک حصہ اس نے لاطینی میں ترجمہ کیا تھا۔ کارلایل کا معاصر انگلینڈ میں ایک عربی داں مستشرق جوزف [illegible] وہائیٹ Joseph White (۱۷۴۶ء - ۱۸۱۴ء) تھا۔ یہ علمائے اوکسفورڈ میں تھا، عبد اللطیف بغدادی کا وہ رسالہ جس میں اس نے مصر کے چشم دید واقعات لکھے ہیں، سب سے پہلے ۱۷۸۹ء میں اسی نے شائع کیا۔ ۱۸۰۰ء میں اس نے اس رسالہ کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ وہائیٹ کے اہتمام سے اس کے علاوہ اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

ہالینڈ | ہالینڈ میں عربی داں مستشرقین کا وجود سترہویں صدی سے ہے۔ اس ملک کے قدیم مستشرقین اربنیوس ERPENNUIES (۱۵۹۶ء - ۱۶۲۴ء) شولٹنس A. S. Chultens (۱۶۸۶ء

۱۶۵۰ء) گولیس Golius (۱۵۹۶ء۔ ۱۶۶۷ء) اور جان جاک شولٹنس J.J. Shultens (۱۶۸۶ء ۔ ۱۷۵۰ء) ہیں۔ یہ تمام اس ملک کے بڑے جلیل القدر مستشرقین ہوئے تھے۔ انکی ذریعے شہر لیڈن علوم مشرقیہ کا مرکز بن گیا تھا لیڈن کے مطبع میں ان مستشرقین کے اہتمام میں عربی کی وہ نادر کتابیں طبع ہوئیں جو باوجود چھپ جانے کے بھی کمیاب ہیں۔ اور ارباب علم اور جوہر شناسوں کے نزدیک نادر قلمی کتابوں کی طرح ان کی قدر و منزلت ہے۔ جیسے تاریخ ابن العمید، ابن شداد کی سیرت صلاح الدین، ابن عرب شاہ کی تاریخ تیموری، میدانی کی ضرب الامثال وغیرہ

اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ میں ہالینڈ میں ہیٹما Haitama پیدا ہوا جس نے ۱۷۷۳ء میں ابن درید کے مقصورہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اور اس پر حواشی کا اضافہ کیا، اسی زمانہ میں ہالینڈ میں ایک دوسرا مستشرق اٹھا جس کا نام شیڈ J. Schnied (۱۷۳۳ء۔ ۱۷۹۵ء) تھا، اس نے صحاح جوہری کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اصول عربیت میں ایک رسالہ لکھا، اور متفرق ادبی منتخبات شائع کئے۔

آسٹریا | اس زمانہ میں آسٹریا میں مشرقیات کا ممتاز عالم فرانسواڈی ڈومبے Fr. von Dombay (۱۷۵۸ء۔ ۱۸۱۰ء) تھا۔ اس نے عرب کی ایک تاریخ شائع کی۔ آخر میں وہ مشرق کے تمام ملکوں میں سے صرف مراکش (مراکو) کے آثار اور دوسری تاریخی یادگاروں کے تحفظ و اشاعت میں مشغول ہوگیا تھا اس نے مراکش کی تاریخ سے متعلق بہت سی مفید کتابیں چھاپ کر شائع کیں جیسے ابن ابی زرعہ کی تاریخ مراکش اور مراکش کے سکوں کی تحقیق وغیرہ اسی اثنا میں وہیں کے پادری جان یاہن نے بھی مشرقی علوم میں خاص شہرت حاصل کی تھی۔ یہ پادری ویانا میں مشرقیات کا درس بھی دیتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے عربی گرامر، عربی لاطینی ڈکشنری اور عربی کے ادبی انتخابات یادگار ہیں،

ڈنمارک | اٹھارہویں صدی کے اختتام پر ڈنمارک میں ایک مستشرق نیوبھر C. Niebuhr (۱۷۳۳ء۔ ۱۸۱۴ء) نے شہرت حاصل کی، اس نے بدقت تمام پورے جزیرۂ عرب کی سیاحت کر کے تین جلدوں میں اس کا سفرنامہ لکھا تھا۔ آخر میں چند باب میں مشرقی قوموں کے عادات و اخلاق کا بھی ذکر کیا ہے ڈنمارک میں نیوبھر کا معاصر جارج زوایگا G. Zoega (۱۷۵۵ء۔ ۱۸۰۹ء) تھا جو ہمہ تن مشرقیات میں مشغول تھا۔ مشرقی ممالک میں سے اس کو خصوصیت کے ساتھ مصر کے آثار اور یادگاروں سے

زیادہ دلچسپی تھی۔

اسپین و پرتگال | اسپین اور پرتگال میں بھی اس زمانہ میں مستشرقین کا وجود تھا، مشہور مستشرقین میں ایک راہب کانیس E.R. Conea (۱۷۳۰ء۔۱۷۹۵ء) تھا، جس نے ایک مدت تک فلسطین اور شام میں اقامت کی تھی، شامیوں کو عربی زبان کی تعلیم دیتا تھا، عربی زبان سکھانے کے لئے اپنی زبان میں چند کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایک گرامر ایک ڈکشنری ہے، اس کا معاصر ایک دوسرا راہب جان سوزا J. Souza (۱۷۳۰ء۔۱۸۱۲ء) تھا، جان سوزا کے والدین پرتگالی تھے، مگر وہ دمشق میں پیدا ہوا تھا، اور شامیوں سے تعلیم حاصل کی تھی، تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ دمشق سے اپنے وطن پرتگال چلا گیا تھا، اور وہاں لشبونہ میں عربی زبان کا پروفیسر ہو گیا تھا، اس کی تصنیفات میں سے ایک مفید کتاب ان پرتگالی الفاظ کی ڈکشنری ہے جو عربی زبان سے ماخوذ ہیں، دوسری کتاب عربی زبان کی نحو ہے، اس کی تیسری تصنیف جو سب سے زیادہ مشہور ہے، ایک تاریخ ہے جس میں اس نے ان تمام حالات اور واقعات کو جمع کیا ہے جو پرتگال کے متعلق عرب مورخین اور جغرافیہ نویسوں کو معلوم تھے۔

اٹلی | اہل اٹلی بھی عربی زبان کے سیکھنے سے غافل نہ تھے، اطالوی مستشرقین میں سے سب سے زیادہ قابل ذکر گرگری گوری R. Gregorio (۱۷۵۳ء۔۱۸۰۹ء) ہے۔ یہ برمو کا باشندہ تھا، اس کو اپنے وطن سسلی کی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی، عربوں کے عہد میں اس ملک کے جو واقعات اور حالات تھے ان پر کئی ضخیم جلدوں میں اس نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام جزیرہ سسلی میں عربوں کی یادگاریں ہے، اس میں اس نے عربی طرز تعمیر، عربی نقش ونگار اور عربی سکوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور ان کا نقشہ بھی دیا ہے۔ اس ملک کا تیسرا مستشرق جی مارٹی G. Mareti (۱۷۳۶ء۔۱۸۰۶ء) ہے، یہ بہت بڑا سیاح اور جہاں گرد تھا، اس نے فلسطین، شام اور مصر کی سیاحت کر کے ان ملکوں کا سفرنامہ لکھا ہے، صلیبی جنگوں کی تاریخ بھی اس نے لکھی ہے۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۰ء تک | اس تیس برس کے عرصہ میں عربی علوم وفنون کی خدمت کی رفتار یورپ میں بدستور رہی، یورپ کے ہر ملک میں مستشرقین کی ایک جماعت طبع وتالیف کتب میں مشغول رہی، اور پہلے

کی طرح اس دور میں بھی فرانس شرقیات کی خدمت میں ممتاز رہا جس کی تفصیل یہ ہے۔

فرانس | یورپ میں اس عہد کا سب سے نامور مستشرق فرانس کا بیرن ڈی ساسی تھا، سنہ وفات کی ترتیب کے لحاظ سے اس کا مفصل ذکر تو تیسرے دور کے مستشرقین کے سلسلہ میں آئے گا، اس نے اپنے وجود سے تمام یورپ میں مشرقی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا۔ یورپ کے ہر حصہ میں اس کے شاگردوں کی ایک جماعت تھی، جو عربی، فارسی، ترکی، عبرانی اور دیگر سامی زبانوں کی تعلیم و اشاعت میں برابر مصروف تھی،

ڈی ساسی کے معاصرین میں ڈی گینے، لنگلے، ڈوبرن اور ہار بن وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے جن کا اوپر کی سطروں میں بھی ذکر آ چکا ہے۔ ساسی کے شاگردوں میں عربی لٹریچر کی واقفیت میں میسو جورڈین A. L. Jourdain (۱۷۸۸ء تا ۱۸۱۸ء) نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، جورڈین نے ملک عجم اور خاندان ہمامکہ کی تاریخ لکھی میر خوند کی تالیف پر، یوپولکھا ملک شام میں شامان یورپ اور عربوں کی جنگ کی عربی تاریخ کا فرنچ میں ترجمہ کیا۔ ابھی دنیا اس نوجوان مستشرق کے مزید فیوض علم کی منتظر تھی۔ کہ تیس برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ڈی ساسی کا دوسرا شاگرد انتوان لیونارڈ ڈی شازی Chezy ہے اس نے بھی مشرقی زبانوں کی واقفیت میں خاص شہرت حاصل کی تھی۔ اس نے عرب، عجم اور دوسری مشرقی قوموں کے متعلق متعدد مضامین فرانس کے سب سے مشہور علمی رسالہ میں لکھے تھے۔ اس کی تصنیفات میں سے تاریخ عجم، منتخبات ادب فارسی، انتخاب کتاب عجائب مخلوقات قزوینی۔ یہ ۱۷۷۳ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔

مشرقیات سے متعلق فرانس کے مستشرقین کی کوششوں کا حاصل پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی ہے جس کو ۱۸۲۱ء میں ڈی ساسی اور اس کے معاصر مستشرقین اور شاگردوں نے قائم کیا تھا۔ ۱۸۲۲ء سے اس سوسائٹی کی طرف سے ایک علمی رسالہ نکالا گیا۔ جو ہر سال دو جلدوں میں شائع ہوتا ہے، ۱۹۰۷ء تک اس رسالہ کی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ جلدیں مشرقی علوم و فنون، مشرقی آثار و شاہد اور السنۂ مشرقیہ کی تحقیقات سے مالا مال ہیں

انگلینڈ | فرانسیسیوں کو دیکھ کر انگریزوں کو بھی مشرقی علوم و فنون کا شوق پیدا ہوا، پیرس ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام کے ایک سال بعد ۱۸۲۳ء میں انگریزوں نے بھی ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، جس کا نام برٹین اینڈ آیرلینڈ رائل ایشیاٹک سوسائٹی رکھا، اس سوسائٹی کے قائم کرنے میں سب سے زیادہ کوشاں بعض

انگریز علمائے علم الآثار (ارکیالوجی) تھے، ان میں چند لوگوں کے نام یہ ہیں کولبروک (Colen brook) جانسٹن (Johneston) اسٹونٹن (Stauntan) وین (W n) ہوگٹن (Houghtan) ۱۸۲۳ء سے سوسائٹی کی تحقیقات ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہ ایک باقاعدہ رسالہ ہوگیا۔ جو ۱۸۳۴ء میں لندن ایشیاٹک ریویو کے نام سے نکلا۔ لیکن انگریزوں کی مشرقی تحقیقات کا دائرہ زیادہ تر ہندوستان کی سرزمین تک محدود ہے، ہندوستان کی یادگاریں، ہندوستان کا قدیم تمدن، ہندوستان کی قدیم زبانیں، زیادہ تر ان کی تحقیقات کا مرکز رہی ہیں، عربی، فارسی، ترکی اور دیگر سامی زبانوں اور علوم کی تاریخ سے یورپ کے دیگر ممالک کے مستشرقین کے مقابلہ میں ان کو بہت کم واقفیت ہے۔

جرمنی | اس دور میں بھی جرمن مستشرقین کو مشرقی معلومات کے حاصل کرنے کا شوق رہا، اور ان کے متعلق انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے ایک کتاب معادن الشرق ہے جو علامہ ہامر (Haman) کے قلم سے نکلی ہے، دوسری "جریدۂ معلومات شرقیہ" ہے۔ یہ کتاب جرمنی میں بمقام پونا چھپی ہے۔

جرمنی میں اس دور میں جو مستشرقین پیدا ہوئے ان میں ایک جے، ولمٹ (walmal) ہے، اس نے ایک عربی لاطینی ڈکشنری ترتیب دی ۱۸۱۸ء میں لبید کے قصیدہ کا اور ۱۸۱۶ء میں عنترہ کے قصیدہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، اور ان پر نوٹس اور حواشی لکھے، کارل روڈلف پیر ہمن (C. R. SPein) اس عہد کا دوسرا جرمن اورینٹلسٹ ہے جس نے مقامات حریری کے اکثر حصہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اور لبید کے معلقہ پر حاشیہ لکھا، جرمنی کا تیسرا مستشرق کارل تھیوڈر جانسن (C. J hansn) ہے، اس نے شہر زبید واقع یمن کی تاریخ موسوم بہ "بغیۃ المستفید فی اخبار زبید" کا عربی سے ترجمہ کیا۔ اور ۱۸۲۸ء میں اس کو پونا سے شائع کیا، یہ کتاب زبید کی نہایت عمدہ تاریخ ہے۔ جو دسویں صدی ہجری کے ایک مشہور یمنی عالم سیف الاسلام بن ذی یزن کی تالیف ہے۔

اٹلی | اس زمانہ میں عربی زبان اور دیگر مشرقی زبانوں کی ترقی ایک مشرقی عیسائی فاضل مسمی شمعون سمعانی کے ذریعہ ہوئی سمعانی طرابلس میں پیدا ہوا، روم میں تعلیم پائی، قلمی کتابوں کے شوق میں مصر و شام کا سفر کیا، ۱۷۸۵ء میں وہ اٹلی کے پاڈوا کالج میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اور آخر عمر یعنی ۱۸۲۱ء تک اسی خدمت میں مصروف رہا، سمعانی نے عرب جاہلیت کی مبسوط تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے، وہ متعدد عجائب خانوں میں شہر کوفہ کے آثار

ومشاہدکا محقق بھی رہا ہے۔

اس عہد کا دوسرا اطالوی مستشرق جان برنارڈ ڈی روزی (سنہ ۱۷۴۲ء - سنہ ۱۸۳۱ء) ہے جس نے اٹلی میں شعبۂ مشرقیات میں خاص شہرت حاصل کی تھی، پاڈوا کالج میں تقریباً پچاس برس تک السنۂ مشرقیہ کا پروفیسر رہا، اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پارما میں اس نے ایک مشرقی مطبع قائم کیا، جہاں سے بہت سی کتابیں نہایت عمدگی اور اہتمام سے شائع ہوئیں۔ ڈی روزی عبرانی زبان میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اس زبان میں اس کی چند تصنیفات بھی ہیں۔ عربی زبان کی بھی اچھی واقفیت رکھتا تھا، اس زبان میں بھی اس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف ہے، اس میں اس نے عربی زبان کے مشہور ادباء اور انشا پردازوں کا تذکرہ لکھا ہے، ڈی روزی کی یہ نادر تصنیف سنہ ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک | سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک بیس برس کی قلیل مدت میں یورپ کے ہر ملک میں مستشرقین کی کافی تعداد پیدا ہوتی رہی، اس دور میں بھی تمام ممالک یورپ میں فرانس مشرقیات میں اول رہا۔

فرانس | اس عہد میں فرانس کے تمام مستشرقین میں بیرون ڈی ساسی Baron de. Sacy نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، ساسی مشرقیات میں پورے یورپ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، اس کی کوششوں نے تمام یورپ کو مشرقی علوم و فنون کی طرف متوجہ کردیا، اس کے بیسیوں شاگرد پیدا ہوئے، جنہوں نے ادبیات مشرقیہ کی تالیف و توسیع میں ممتاز کوششیں کیں۔

ساسی سنہ ۱۷۵۸ء میں پیرس میں پیدا ہوا، اور پیرس ہی میں ۱۸۳۸ء اس نے وفات پائی، اس کو بچپن ہی سے علوم و فنون کا شوق تھا، یورپین زبانوں کی تحصیل کے بعد اس نے مشرقی زبانوں کی تحصیل شروع کی مشرقی زبانوں میں علی الترتیب اس نے عبرانی، سریانی، کلدانی، سامری، عربی، فارسی اور ترکی زبانیں حاصل کیں، ان میں سے اکثر زبانوں میں وہ بڑی مہارت رکھتا تھا، خصوصاً عربی و فارسی زبان میں اس کو کامل دستگاہ حاصل تھی، اگر ہم تفصیل کے ساتھ بتانا چاہیں کہ ڈی ساسی نے السنۂ مشرقیہ کی ترقی و توسیع میں کیا کوششیں کیں، اس نے کتنے مضامین لکھے، کتنی کتابیں ایڈٹ کیں، کتنے رسالے نکالے، کتنے علمی سوسائٹیوں کی سرپرستی کی، کتنی لائبریریاں قائم کیں، اور ان کو ترقی دی، تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ اس لئے یہ کہنا کافی

ہے، کہ ڈی ساسی کی تنہا ہمت وکوشش سے دو کو سے زیادہ مشرقی تصنیفات زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، ان میں سے اکثر ضخیم اور کثیر المعلومات ہیں، ہم اس موقع پر چند خاص کتابوں کا ذکر کرتے ہیں عربی گرامر (۲ جلد) منتخبات ادبیات عربی (۳ جلد) نوادر لغت (ایک ضخیم جلد) تاریخ عرب جاہلیت تذکرہ دروز (۲ جلد) یہ کتابیں ڈی ساسی کی خاص تصنیفات ہیں، کلیلہ دمنہ، مقامات حریری مع شرح (۲ جلد) سفرنامہ مصر عبداللطیف بغدادی وغیرہ وہ کتابیں ہیں، جو اس کی اڈیٹری میں شائع ہوئی ہیں،

ڈی ساسی کی وفات سے کچھ سال پہلے ۱۸۳۲ء میں فرانس کا ایک اور مستشرق وفات پا چکا تھا، جس کا نام جان جاک امانویل سیڈیلو J. E. Sidillat تھا، سیڈیلو کی پیدائش ۱۷۷۷ء میں ہوئی تھی، وہ فرانس کے مدرسہ السنۂ مشرقیہ میں معلم تھا، آخر میں وہ سب چھوڑ چھاڑ کر علم ہیئت کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تھا، اس نے ابوالحسن علی مراکشی کی کتاب جامع المبادی والغایات کا فرنچ زبان میں ترجمہ کیا، جو آلات فلکیہ کے بیان میں ہے، اس کے علاوہ اس نے ابن یونس اور ابوالوفاء وغیرہ ہیئت دانان اسلام کی متعدد تصانیف کا فرنچ میں ترجمہ کیا، سیڈیلو نے مشرقی تاریخ اور مشرقی ریاضیات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔

سیڈیلو سے بھی زیادہ مشہور ایک اور فرنچ مستشرق ہے جس کا نام کوسن دی پرسیوال C. de Perceval ہے، ۱۷۵۹ء اس کا سال پیدائش اور ۱۸۳۵ء اس کا سال وفات ہے، پیرس میں وہ مشرقی قلمی تصنیفات کا ناظر تھا، اور پیرس ہی کی شاہی تعلیم گاہ میں عربی زبان کا پروفیسر تھا، کی ایڈیٹری میں عربی زبان کی متعدد کتابیں چھپ کے شائع ہوئیں، جن میں قابل ذکر حسب ذیل کتابیں ہیں، معلقات سبعہ، زیج حاکمی ابن یونس، کتاب الصور السمایۂ عبدالرحمٰن صوفی، مقامات حریری، امثال لقمان ضمیمۂ الف لیلہ (۲ جلد) تاریخ جزیرہ سسلی بعہد اسلام نویری، ابن یونس کی زیج حاکمی، اور صوفی کی کتاب الصور السماویہ کا فرنچ میں ترجمہ کیا، یہ موخر الذکر دونوں کتابیں عربی زبان میں علم ہیئت کی نادر تصنیف ہیں۔

اسی عہد میں ڈی ساسی کے بعض شاگردوں نے بھی شہرت حاصل کی، جن میں سے ایک شخص جوبیر Sume Amed-onJaubert ہے جو پیرس میں السنۂ مشرقیہ کا پروفیسر تھا، اور مترجم کی حیثیت سے نپولین اول کے ساتھ مصر گیا تھا، آرمینیہ اور ممالک عجم کی اس نے سیاحت بھی کی تھی، اس نے ان ملکوں کا سفرنامہ بھی لکھا ہے ترکی اور فارسی میں اس کی متعدد تصنیفات ہیں، شریف ادریسی کے جغرافیہ کا اسی نے دو جلدوں میں فرنچ میں

ترجمہ کیا یہ دونوں جلدیں ۱۸۲۶ء سے پیرس میں چھپنی شروع ہوئیں، اور ۱۸۴۸ء میں چھپ کر نکل ہوئیں، جوبر نے تاریخ شہرخانہ کا بھی فرنچ میں ترجمہ کیا۔

ڈی ساسی کے اور شاگردوں کا ذکر دوسرے ملکوں کے مستشرقین کے سلسلہ میں آیندہ آئے گا۔

جرمنی | جرمنی میں اس عہد میں مشرقیات میں جو ترقی ہوئی، وہ فرانس کے قریب قریب تھی، جرمن مستشرقین میں ایک آرٹسٹ فرڈریک روزن مولر E.F.K. Rodenmuller ہے اس کا سال ولادت ۱۷۶۸ء اور سال وفات ۱۸۳۵ء ہے لیپزگ میں وہ السنۂ مشرقیہ کا پروفیسر تھا، اس نے لاطینی زبان میں عربی زبان کی ایک گرامر لکھی، عربی علوم و فنون کے منتخب مضامین و رسائل کا ایک مجموعہ مع لاطینی ترجمہ کے تین جلدوں میں شائع کیا، زہیر کا معلقہ حریری کے بعض مقامات اور میدانی کے امثال کا ایک ٹکڑا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

جس سال روزن مولر کا انتقال ہوا ہے اسی سال یعنی ۱۸۳۵ء میں ایک دوسرے جرمن اورینٹلسٹ نے بھی وفات پائی، جس کا نام H.J. Klaproth تھا، اس نے مشرقی زبان کی تحصیل کے لئے روس اور دیگر ممالک یورپ کا سفر کیا، فراغت کے بعد جب وطن واپس آیا۔ تو گورنمنٹ نے اس کو السنۂ مشرقیہ کا معلم مقرر کیا اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تمام مشرقی زبانوں کا باہم مقابلہ کیا، اور ان میں باہم اتحاد و اشتراک ثابت کیا۔ السنہ سامیہ کے اصول پر بھی اس نے کامل بحث کی، مشرقی اقوام کی تاریخ اور لٹریچر پر چند کتابیں لکھیں وہ مشرقی زبانیں عموماً اور تاتاری اور گرجی زبانیں خصوصاً نہایت عمدہ جانتا تھا۔

کلاپروتھ کا معاصر جرمنی میں ایک اور مستشرق بھی موجود تھا۔ جس کا نام ہابیکٹ C.M. Habicht تھا۔ یہ گو بریسلو قع جرمنی کا باشندہ تھا لیکن وہ فرانس کا تربیت یافتہ تھا، علوم مشرقیہ میں ڈی ساسی کا شاگرد تھا، وطن میں واپسی کے بعد وہاں السنۂ مشرقیہ کا معلم مقرر ہوا۔ اس نے اپنے اہتمام و تصحیح سے عربی رسائل کا ایک مجموعہ شائع کیا، جن کی اصل مراکش (مراکو) مصر اور شام کے کاتبوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اس مجموعہ کا اس نے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا، میدانی کے ضرب الامثال کا انتخاب بھی حواشی و تعلیقات کے ساتھ اس نے چھاپا ہے، ہابیکٹ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے الف لیلہ کو ۱۸۲۴ء میں چھاپنا شروع کیا، اور اس کی زندگی میں اس کے آٹھ حصے شائع ہوئے۔ بقیہ حصے ایک دوسرے

مستشرق قلمی نسخے آیر نے چھاپ کر پورے کئے، ہابیکٹ نے اپنے شاگردوں ہاگن Hagin اور شال Shall کی مدد سے الف لیلہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، ہابیکٹ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوا، اور ۱۸۳۹ء میں اس نے وفات پائی۔

اس دور میں جرمن مستشرقین میں سے گیز نیوس H.W.genenius نے خاص شہرت حاصل کی۔ ۱۷۸۶ء میں اس کی پیدائش اور ۱۸۴۲ء میں اس کی وفات ہے، اس کو بچپن ہی سے سامی زبان کا شوق تھا، اور بالآخر سامی زبانوں کا امام ہوگیا، سریانی، کلدانی، فینقی، حمیری، سامی، عبرانی، اور عربی زبانوں سے واقف تھا خصوصاً عبرانی زبان میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا، تین جلدوں میں اس نے عبرانی کی ضخیم ڈکشنری لکھی، جو نگاہ قبول سے دیکھی گئی، جزیرہ مالٹا کے عربوں کی بگڑی ہوئی عربی پر گیز نیوس کا ایک رسالہ یادگار ہے۔

اسی عہد میں جرمنی میں ایک اور مستشرق پیدا ہوا، اس کا نام ایچ. جی. پولوس H.C.Pallus تھا، اس نے بہ ترتیب ٹوبنگ کالج، لندن اور آکسفورڈ میں السنہ مشرقیہ کی تعلیم دی، پولوس گو ملحد تھا۔ لیکن تورات کی تفسیر میں اس کو کمال حاصل تھا، سعدی نام کا ایک عالم جو فیوم واقع مصر کا باشندہ تھا اس نے مسیحی کتب مقدسہ کا نویں صدی عیسوی میں عربی میں ترجمہ کیا تھا، پولوس نے اس نسخہ کو چھاپا، اور اس پر نوٹ لکھے، عربی زبان کے قواعد میں ایک رسالہ لاطینی میں تالیف کیا، ۱۷۶۱ء سال پیدائش، اور ۱۸۵۰ء سال وفات۔

مشہور جرمن اورنٹیلسٹ سی، ایم فراھن C.M.Farhin نے بھی اسی دور میں فروغ پایا، وہ روسٹک میں ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا، اور روس میں ۱۸۵۱ء میں وفات پائی، فراھن کو مشرق کے قدیم سکوں کی شناخت اور تاریخ میں کمال حاصل تھا، اس کی تالیفات کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، اس نے عربی زبان کی متعدد کتابیں شائع کیں، اور ان کا لاطینی میں ترجمہ کیا جن میں قابل ذکر حسب ذیل کتابیں ہیں، عرب سیاح ابن فضلان کا سفرنامہ روس مع ترجمہ جرمن، مسلمان جغرافیہ نویس شمس الدین الدمشقی کی کتاب تحفۃ الدہر فی عجائب البر والبحر اور ابن الوردی کا جغرافیہ مصر منتخب از فریدۃ العجائب

فراہن نے ابن فضلان کے سفرنامہ کے ساتھ دیگر عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے روس قدیم کے متعلق جو کچھ لکھا تھا اس کو بھی بطور ضمیمہ کے شائع کر دیا ہے، نخبۃ الدہر فراہن کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔ فراہن کے بعد ایک دوسرے مستشرق مہرن   نے بہ ملت ۲ نے اس کو اتمام کو پہنچایا۔ فراہن نے اسلامی سکوں پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔

اسی عہد میں جرمنی میں مشرقی انجمنیں قائم ہوئیں، مشرقی رسالے نکلے مستشرقین نے مشرقی معلومات کی توسیع کے لئے ایک جماعت قائم کی۔ ان امور کا مفصل ذکر آئندہ ایشیاٹک سوسائٹیوں کے بیان میں آئیگا۔

سوئیٹزرلینڈ | سوئیٹزرلینڈ میں اس دور میں جان ہمبرٹ   کے زمانہ میں پیدا ہوا، سوئیٹزرلینڈ کے پایۂ تخت جنیوا میں سنہ ۱۷۹۲ء میں اس کی پیدائش ہوئی۔ پیرس میں ڈی ساسی سے السنۂ مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اپنے وطن میں مشرقیات کا معلم مقرر ہوا، اس نے ایک حد تک عربی زبان کی بڑی خدمت کی اشعار عرب کا انتخاب کیا اور اس کو فرنچ ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، عربی زبان کی تحصیل کے لئے فرنچ اور لاطینی زبان میں اسکول بکس کا سلسلہ تالیف کیا۔ عرب کے علوم اور زبان پر تنقیدی مضامین لکھے سنہ وفات سنہ ۱۸۵۱ء ہے۔

انگلینڈ | اس دور میں انگریزوں میں ایک مستشرق ولیم مارسڈن نامی تھا۔ مارسڈن ڈبلن میں سنہ ۱۷۵۴ء میں پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی زندگی کا بڑا حصہ جزیرۂ سماترا میں گذرا، جہاں ایک مدت سے عرب سکونت پذیر ہیں، اور اب وہ یورپ کے قبضہ میں ہے، مارسڈن نے اس جزیرہ کی تاریخ لکھی، اور یہاں کی زبان پر ایک رسالہ تالیف کیا، مشرقی سکوں کے متعلق عموماً اور اسلامی سکوں کے متعلق خصوصاً اس کے مضامین خاص شہرت رکھتے ہیں۔ مارسڈن کے پاس ایک مشرقی کتب خانہ بھی تھا جس میں عربی زبان کی قلمی کتابیں کثرت سے تھیں، یہ بیش قیمت کتب خانہ اس نے برٹش میوزیم کو ہدیۃً دے دیا، سال وفات سنہ ۱۸۳۶ء ہے۔

ہالینڈ | اس عہد میں ہالینڈ میں پروفیسر ایچ۔ اے ہاکر H-M-Hamaker کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچا۔ ہاکر اسٹرڈم میں سنہ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوا، اور مشہور مستشرق ولمٹ سے تحصیل علم کی، یورپ کی تمام زبانوں کے علاوہ اس نے تھوڑی ہی مدت میں اکثر سامی زبانیں سیکھیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے وہ لیڈن کالج میں

عربی، سریانی اور کلدانی زبانوں کا پروفیسر تھا، اس نے لیڈن کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں پر تبصرہ لکھا، واقدی اور مقریزی کی بعض تصنیفات احمد بن طولون شاہ مصر کی تاریخ اور ابن زیدون کا رسالہ شائع کیا، ہما کرنے اپنے شاگردوں کی بھی ایک کافی جماعت تیار کی تھی،

ایشیاٹک سوسائٹیاں | ایشیاٹک سوسائٹیوں میں اس دور میں فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی کا اول نمبر رہا، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں کی سیکڑوں کتابیں اس نے شائع کیں، سوسائٹی کے علمی رسالہ نے بھی مشرقیات کے متعلق کافی لٹریچر بہم پہنچایا، علوم مشرقی کی ترقی و توسیع میں لندن ایشیاٹک سوسائٹی کا دوسرا نمبر ہے، لیکن اس کی تحقیقات کے جولانگاہ زیادہ تر ہندوستان اور مشرق اقصیٰ رہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس دور میں نئی زندگی حاصل کی، ۱۸۳۲ء میں اس نے اپنا ایک علمی رسالہ بھی نکالنا شروع کیا، یہ مشرقی تحقیقات کے لحاظ سے یورپین ایشیاٹک سوسائٹیوں کے ہم پلہ ہے، اس رسالہ میں زیادہ تر ہندوستانی یادگاروں کے متعلق بحث ہوتی ہے، اور کبھی کبھی عربی و فارسی علوم و آثار کے متعلق بھی مباحث ہوتے ہیں، ہندوستان کے سلاطین کی یادگاروں کو پیش کرنا بھی اس کا ایک خاص مقصد ہے،

جرمنی میں اس عہد میں تمام السنہ مشرقیہ کا عموماً اور عربی زبان کا خصوصاً خاص ذوق پیدا ہوا، اہل قلم اور باہمت جرمن مستشرقین نے اس ذوق کی تسکین کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کے ممتاز ممبروں کے نام یہ ہیں: ایوالڈ Ewald گابلنز V.D. Gabelentz کوسگرٹن Kos

روڈیگر Rodiger Janten اس جماعت کی طرف سے مشرقیات پر ایک رسالہ بھی جاری ہوا، جس میں عربوں کی تاریخ اور لٹریچر پر بہت سے مضامین نکلے، اس جماعت کو تھوڑے ہی دنوں میں وہ وسعت حاصل ہوئی، کہ یہ ۱۸۴۵ء میں عظیم الشان جرمن ایشیاٹک سوسائٹی کی صورت میں تبدیل ہوگئی، ۱۸۴۷ء سے اس سوسائٹی کا خاص علمی رسالہ نکلنا شروع ہوا، جس میں عربی علوم و فنون، عربی تمدن، اور عربی زبان کے متعلق کافی مضامین ہوتے ہیں، یہ سوسائٹی جس عزم، استقلال اور ثابت قدمی سے کام کر رہی ہے، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے، کہ آج سے چند سال پہلے اس سوسائٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی منائی گئی

مستشرقین یورپ

۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۰ء تک

۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۰ء تک تیس برس ہے۔ اس قلیل مدت میں یورپ میں جس کثرت سے اور جس پایہ کے لوگ پیدا ہوئے وہ حیرت انگیز ہے۔ دور سابق کی طرح اس دور کا بھی مرکز مستشرقیات میں فرانس ہی رہا۔ فرانس اس دور میں بھی علامہ دی ساسی کے شاگردوں سے معمور رہا جو علوم مشرقیہ کی ترقی و تحقیق میں اپنے استاد کے قدم بقدم چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک فلجانس فرینل تھا۔ فرینل کا سال پیدائش ۱۷۹۵ء ہے۔ ابھی اس کا عنفوان شباب تھا کہ اس کو علوم مشرقیہ کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں حکومت فرانس نے اس کو جدہ میں اپنا قونصل بنا کر بھیجا۔ ۱۸۵۲ء میں علمائے عرب و ترکی والوں کی توجہ بابل کے قدیم آثار دریافت کرنے کی طرف منعطف ہوئی اور اس کے لیے ایک ٹیم روانہ کی گئی۔ فرینل اس کا سرگروہ مقرر کیا گیا۔ وہ چند دن اگرچہ تین برس تک اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہا۔ ۱۸۵۵ء میں دار الحکومت عراق میں اس نے وفات پائی۔ فرینل نے متعدد علمی کارنامے اپنی یادگار چھوڑے۔ اس نے شنفری کے مشہور قصیدہ لامیۃ العرب کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا۔ عرب جاہلیت کی تاریخ میں چند رسالے لکھے۔ قدیم حمیری قبائل کے کتبوں پر جو یمن کے کھنڈروں میں پائے جاتے ہیں، مضامین لکھے۔

اس عہد کا فرینل سے بھی زیادہ مشہور مستشرق ایٹین کاترمیر ہے، جو کہ دی ساسی کا شاگرد تھا لیکن عزت و شہرت میں اس سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا۔ کاترمیر ۱۷۸۲ء میں پیرس میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان ہنگامۂ آفات تھا، وفات پائی۔ دی ساسی سے علوم مشرقیہ کی تعلیم پائی تھی۔ ابھی نوخیز تھا کہ وہ فرانس کے پبلک کتب خانہ کا اسسٹنٹ ہو گیا۔ اس کے بعد جبکہ وہ ابھی تیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا، کالج کا پروفیسر ہو گیا۔ ۱۸۱۵ء میں فرنچ اکاڈمی کا ممبر منتخب ہوا۔ پھر گورنمنٹ نے اس کو اپنی تعلیم گاہ میں عبرانی، سریانی، کلدانی اور فارسی زبانوں کا پروفیسر مقرر کیا۔ اس تعلیم گاہ میں

السنہ مشرقیہ کی تدریس میں اس نے ایسی شہرت حاصل کی، کہ ڈی ساسی کے انتقال کے بعد اس کا صحیح جانشین ہوگیا، اس کی اپنی تالیفات کے علاوہ اس کے تحشیہ واہتمام سے جو مشرقی کتابیں شائع کیں، ان کی تعداد سَو سے زیادہ ہے، عربی زبان کی بھی متعدد کتابیں اس کی یادگار ہیں، جو صحت وحسن طبع کے لحاظ سے عدیم النظیر ہیں، اس نے مقریزی کی تاریخ المما لیک (مصر کے غلام بادشاہوں کی تاریخ) کا چار جلدوں میں ترجمہ کیا، اور اس پر حواشی لکھے، مصر کے مشتبہ اور مبہم جغرافیائی اور تاریخی واقعات کی تحقیق دو جلدوں میں کی، نبطی قوم اور اس کے آثار قدیمہ کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی، مقدمہ ابن خلدون کو تین حصوں میں نہایت اہتمام سے شائع کیا، علامہ میدانی کی ضرب الامثال اور سلطان صلاح الدین اور نور الدین کے حالات میں تاریخ الروضتین کا انتخاب شائع کیا، عرب مورخین اور جغرافیہ نویسوں پر طول طویل مضامین لکھے، بدویوں کے اخلاق وعادات پر مضمون لکھا، رشید الدین کی تاریخ مغل کا ترکی میں ترجمہ شائع کیا، ان کے علاوہ قبطی، بابلی زبانوں، اہل ہند، اہل افریقہ اور یہودیوں کی تاریخ وادب اور آثار قدیمہ پر اس کی تصنیفات یادگار ہیں۔

ڈی ساسی کے ممتاز شاگردوں میں ایک گرینگرٹ ڈی لاگیر نج ہے، سال پیدائش ۱۷۹۰ء ہے۔ عربی اور فارسی زبانوں کی تکمیل کے بعد گورنمنٹ نے اپنے پبلک پریس کی مشرقی مطبوعات کی تصحیح کی خدمت اس کے سپرد کی، ۱۸۵۹ء میں اس نے وفات پائی، عربی زبان کے نظم و نثر کے منتخبات کا اس نے ترجمہ کیا، دیوان کا ایک مجموعہ چھاپا، متنبی اور ابن فارض کے کلام کا انتخاب کیا، اور اس پر حواشی لکھے، اور اس کا فرنچ میں ترجمہ کیا، مسلمانان اندلس کی تاریخ لکھی، عربی شاعری پر لوگ جو اعتراضات کرتے تھے، ان کے تشفی بخش جوابات دیئے۔

اسی زمانہ میں فرانسیسی مستشرقین کے گروہ میں ایک اور باکمال مستشرق نوئل ڈی ورجرس موجود تھا جس کا سنہ پیدائش ۱۸۰۵ء اور سنہ وفات ۱۸۶۷ء ہے، ڈی ورجس نے متعدد عربی تصنیفات شائع کیں، ان میں سے دو کتابیں یہ ہیں، تاریخ ابی الفدا، تاریخ بنی الاغلب (شاہان سسلی) منتخب از تاریخ ابن خلدون، ڈی ورجس کے استاد ڈی برسوال نے عرب جاہلیت کی تاریخ لکھی تھی،

ترجمے اس انتخاب کے ہیں۔ [illegible] کی قدر و قیمت کا اضافہ کیا

اسی سال ان کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ایک [illegible] اور [illegible] سے [illegible]

[illegible] ۱۱۹۰ [illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۲۰۳ [illegible]

[illegible] ۱۲۱۱ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۱۸۱۱ء میں ایک [illegible] کا انتقال ہوا۔ اس کا نام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دو کتابیں یہ ہیں، ابن میمون کی دلیل الحائرین اور ابن جبر ول کی معین الحیات، اس کے علاوہ اس نے عربی اور عبرانی شاعری پر رسائل لکھے، فلسطین کی تاریخ لکھی، جو درحقیقت یہودیوں کا مولد و مسکن ہے، اہل عرب اور اہل ہند کے فلسفہ کی تشریح کی، مقامات حریری کا فرنچ میں ترجمہ کیا، فینشین قوم اور اس کے ان آثار قدیمہ اور کتابوں پر مضامین لکھے، جو سواحل شام میں دریافت ہوئے تھے۔

الجزائر (الجیریا) میں ایک فرنچ مستشرق نے عربی زبان کی تعلیم و تدریس میں خاص شہرت حاصل کی۔ اس کا نام لوئی جاک برنیر تھا، فرانس میں برنیر ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوا تھا، اور الجزائر میں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی، برنیر نے بڑے بڑے جلیل القدر مستشرقین سے عربی زبان کی تعلیم پائی تھی، الجزائر کے دارالحکومت میں تینتیس ۳۳ سال تک عربی زبان کا معلم رہا، اس کی کوشش کے نتائج عربی زبان کی تعلیم کے لئے اس کی چند کتابیں ہیں، جن سے الجزائر کے ان طلبہ کو جو صحیح اور فصیح عربی پڑھنا چاہتے ہیں، بڑی مدد ملی، صرف و نحو وغیرہ پر اس کے متعدد رسائل ہیں، عوامی عربی زبان پر اس نے مضامین لکھے ہیں، عربی صرف و نحو کی متعدد کتابوں کا فرنچ میں ترجمہ کیا، جن میں سے ایک کتاب اجرومیہ ہے، جس کی تعلیم مصر و شام میں ہدایۃ النحو اور کافیہ کی طرح عام ہے۔

میسو برنیر کا معاصر پروفیسر کمباریل (cum-ba-ril) ہے، پروفیسر موصوف نے بھی عربی زبان کی تعلیمی کتابوں کی تالیف و ترجمہ میں الجزائر میں بڑی غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے، اس کی علمی زندگی کا زمانہ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان ہے۔

فرانس کے مستشرقین میں برشین کازمرسکی . . . . بھی ایک باکمال اورنٹلیسٹ گذرا ہے، یہ پولینڈ میں پیدا ہوا، اور فرانس میں سکونت اختیار کی، اس کے اہتمام میں مفید مشرقی تصنیفات شائع ہوئیں، اس کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کا نہایت اہتمام سے فرنچ میں ترجمہ کیا، یہ ترجمہ سلاست اور روانی کی حیثیت سے فرانس کے علمی حلقہ میں مشہور ہے، کازمرسکی نے عربی اور فرنچ ڈکشنری بھی تالیف کی ہے، جس کے حسن قبول کی دلیل یہ ہے، کہ پیرس میں چھپنے کے بعد اس کا ایک اڈیشن مصر میں چھاپا گیا، اس کا سنہ وفات تقریباً ۱۸۰۰ء ہے۔

عربی زبان کے عشاق میں میسو پیرون (A. Perron) کا بھی نام ہے، جس نے کثیر التعداد عربی تصنیفات چھاپ کر شائع کیں، بہت سی عربی کتابوں کا فرنچ میں ترجمہ کیا، ۱۸۲۲ء میں عربی زبان کے اصول و قواعد میں ایک کتاب تالیف کی، طرفہ متلمس، عنترہ وغیرہ مشاہیر شعرائے عرب پر مضامین لکھے اور ان کے منتخب کلام کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا، ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کا بھی فرنچ میں ترجمہ کیا۔ کتاب سیف التیجان، محمد ٹیونسی کا سفرنامہ درفور (واقع افریقہ) سیوطی کی طب نبوی، شعرانی کی کتاب المیزان (فقہ) ابوبکر بن بدر کی کامل الصناعتین (ادب و بلاغت) خلیل بن اسحاق مالکی کی کتاب المختصر (فقہ) اس کا نام تو مختصر ہے، لیکن یہ چھ برس کی محنت میں ۱۸۵۴ء میں سات جلدوں میں شائع ہوئی، موسیو پیرون نے اس کتاب پر تعلیقات اور حواشی بھی لکھے ہیں،

فرانسیسی مستشرقین میں پروفیسر کلیمن مولٹ بھی خاص پایہ رکھتے ہیں، جنھوں نے عرب کے علوم و فنون میں سے صرف فن زراعت کا اپنے لئے انتخاب کیا، عربوں کے فن زراعت اور اس کے موجودہ آثار اور یادگاروں پر ان کی تصنیفات مشہور ہیں۔ ابن العوام اشبیلی کی کتاب الفلاحت کا دو جلدوں میں فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، اور اس پر مفید حواشی لکھے، اصل کتاب ۱۸۰۲ء میں میڈرڈ پایہ تخت اسپین میں چھپ چکی تھی، فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں موسیو مولٹ کے قلم سے عربوں کے علم موالید ثلثہ یعنی علم جمادات، علم نباتات، علم حیوانات پر بڑے پر مغز اور پر از معلومات مضامین بھی نکلے ہیں، سنہ وفات ۱۸۷۰ء ہے،

جرمنی | اس دور میں تمام جرمن مستشرقین میں جارج ویلیم فریٹاگ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوا، اور ۱۸۶۱ء میں وفات پائی، فریٹاگ ہمت و محنت اور استقلال کا مجسمہ تھا، پیرس میں ڈی ساسی سے السنۂ مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی، ۱۸۱۹ء میں بونا کالج میں السنۂ مشرقیہ کا معلم مقرر ہوا، اس زمانہ سے لے کر اپنی آخر عمر تک وہ نہایت محنت، اور جفاکشی کے ساتھ عربی زبان کی نادر تصنیفات کے طبع و اشاعت میں مصروف رہا، اس کی خاص تالیفات میں سے چار ضخیم جلدوں میں ایک عربی لاطینی ڈکشنری ہے، جو اس کی سات برس کی متصل و پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے، اس کی جفاکشی کا یہ حال ہے، کہ وہ گیارہ گھنٹے تک مسلسل درس دیتا تھا جس کے درمیان ایک لحظہ بھی آرام نہیں کرتا تھا، فریٹاگ سب سے پہلا شخص ہے،

جس نے ابو تمام کے حماسہ کو جو عربی لٹریچر کا خزانہ ہے، مع شرح تبریزی چھاپ کر شائع کیا، اور اس کا تمام و کمال لاطینی میں ترجمہ کیا۔ عبد اللطیف بغدادی کا تذکرہ، کمال الدین کی تاریخ حلب، ابن عرب شاہ کی فاکہۃ الخلفاء کو شائع کیا، اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اور ان پر حواشی اور نوٹ لکھے، میدانی کی ضرب الامثال کو چار جلدوں میں نہایت اہتمام سے چھاپا، اس کا ترجمہ کیا، اس پر نوٹ لکھے، اس کا کئی کئی حیثیت سے انڈکس تیار کیا، میدانی سے جو ضرب الامثال لکھنے سے رہ گئے تھے، ان کا اضافہ کیا، عربی زبان کے فن عروض پر جرمن زبان میں ایک مفصل رسالہ لکھا، عربی زبان کے منتخبات نظم و نثر کا مجموعہ چھاپا، فریٹاگ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بچاس برس گذر گئے، مگر اب تک اس کا نام جرمن مستشرقین کے نزدیک محنت و جفاکشی کی زندہ تصویر ہے۔

ان جرمن مستشرقین میں سے جن کا نام علم و فضل کی دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کا مستحق رہے گا، ایک جان گڈ فریڈ کارٹن (J.C. Kozegarten) ہے، بروسیا میں ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ گریس والڈ کی مشہور درسگاہ میں تعلیم پائی، ابتدائے تعلیم سے عربی زبان کا دلدادہ تھا، اس لئے اس کے باپ نے اس کو ڈی ساسی کے سپرد کر دیا جس کی آغوش تعلیم میں یہ پل کر جوان ہوا، عربی زبان کی تکمیل کے بعد ترکی، فارسی، ارمنی زبانیں حاصل کیں، تعلیم سے فارغ ہو کر السنۂ مشرقیہ کی ترقی و اشاعت میں مشغول ہوا، پیرس کی قلمی کتابوں کی نقلیں لیں، اور اپنے وطن پہنچ کر ان کا ایک حصہ شائع کیا، شائع ہونا تھا کہ ملک نے حسن قبول کی سند دی، گریس والڈ کی درسگاہ نے جس کا یہ تربیت یافتہ تھا، بحیثیت معلم کے اس کو اپنے مشرقی اسٹاف میں جگہ دی، اس کی زندگی کا کارنامۂ اعظم یہ ہے، کہ تاریخ طبری جس کی موت کا مشرقی کتب خانے فیصلہ کر چکے تھے، کارٹن کی عرق ریزی، محنت جانکاہی اور کوشش نے اس کو زندہ کر دیا، اس کی دو جلدیں مع ترجمہ لاطینی شائع کیں، لاطینی زبان میں عربی زبان کی ایک گرامر لکھی، شعرائے قبائل ہذیل کے کلام کا ایک حصہ لندن میں چھپوایا، ابو الفرج اصفہانی کی گراں پایہ تصنیف اغانی جو عربی زبان میں فن محاضرات کی سب سے مستند اور بڑی وسیع تصنیف ہے، اس کی ایک جلد شائع کی، اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اس پر مقدمہ لکھا، جا بجا نوٹ لکھے، مشہور تغلبی شاعر عمرو بن کلثوم کا قصیدہ مع حواشی چھاپا، ان کے علاوہ عربی مصری اور سنسکرت زبان کی تحقیقات اس کی یادگار ہیں۔

تیسرا جرمن اورنٹیلسٹ جس کا ذکر ہم آئندہ سطروں میں کریں گے، وہ سابق الذکر دونوں مستشرقین سے کم رتبہ نہیں ہے، یعنی گستا و فلوگل (Flügel Gustav) ہے، ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا، لیپزگ میں علمائے مستشرقین سے تعلیم پائی، یہاں سے وانا گیا، دو سال وہاں کے مشہور قلمی کتب خانہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہا، وہاں سے نکل کر یورپ کے اکثر پایہ تختوں کی سیاحت کی، پیرس میں ایک مدت تک اقامت کی، وہاں کے قلمی کتب خانوں کی سیر کی، وہاں کے علماء سے فیوض حاصل کئے، وطن واپس آنے پر وہاں کی متعدد درسگاہوں میں پروفیسر رہا، اہل حکومت نے اس کی قدر کی، اور اس کو مشرقی تصنیفات کے طبع و اشاعت کی طرف مائل کیا، فلوگل نے اس ترغیب سے پورا فائدہ اٹھایا، اس کی کوشش اور سعی سے عربی زبان کی تقریباً پچاس کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سب سے بہتر سب گراں پایہ، اور سب سے زیادہ قابل قدر حاجی خلیفہ چلپی کی کشف الظنون کی سات ضخیم جلدیں مع ترجمہ لاطینی و فہرست و ملحقات اور کتاب الفہرست ابن ندیم مع فہرست و مقدمہ ہیں، کشف الظنون عربی علوم و فنون و تصنیفات کی ہزار سالہ تاریخ ہے، کتاب الفہرست مسلمانوں کی ابتدائی چار صدیوں کی علمی تاریخ کا خزانہ ہے، دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی نظیر عربی زبان کے سوا دنیا کی کوئی دوسری علمی زبان نہیں پیش کر سکتی، فلوگل کا اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان جس سے مسلمان کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتے، یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کی فہرست الفاظ نجوم الفرقان کے نام سے مرتب کی جس کی مدد سے قرآن مجید کی ہر آیت حسب ضرورت و حاجت نکالی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ اس نے تین ضخیم جلدوں میں تاریخ عرب لکھی، ثعالبی کی مونس الوحید چھاپ کر شائع کی، سال وفات ۱۸۷۰ء ہے۔

فرانٹس واپک علوم و فنون اسلامیہ کے جلیل القدر محسنین میں ہے، لیپزگ سے متصل ایک گاؤں میں ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوا، ہمبرگ میں تعلیم پائی، یہاں سے برلن کا سفر کیا، برلن میں صرف ریاضیات کی تعلیم حاصل کی، ۱۸۴۸ء میں مشہور مستشرق فریتاگ سے بونا میں ملا، اور اس سے عربی زبان کی تحصیل کی، واپک کو چونکہ ریاضیات سے خاص مناسبت تھی، اس لئے علوم مشرقیہ میں بھی اس نے ریاضیات ہی کا میدان اپنے لئے مخصوص کیا، عرب علماء نے حساب جبر و مقابلہ، ہندسہ اور ہیئت میں جو کچھ لکھا تھا، اس کو پڑھا عربی

ریاضیات کی تصنیفات بہم پہونچائیں، عمر بن ابراہیم خیام کی کتاب جبر و مقابلہ اور ابوالحسن کوفی کی کتاب الفخری فی الجبر والمقابلہ، ابوعثمان دمشقی کی شرح مقابلہ دہم اوقلیدس فی الاعظام المنطقۃ والصم کو شائع کیا، وایک نے عربوں کے علوم ریاضیہ پر پچاس سے زیادہ مضامین لکھے، یہ مضامین فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل اور برلن، رومیہ، پیرس، اور پیٹرس برگ کے علمی رسالوں میں چھپے، وایک جب کوئی قدیم یادگار کتاب شائع کرتا، تو ہمیشہ یورپ کی کسی نہ کسی زبان میں اس کا ترجمہ بھی ضرور کرتا، عربوں کی ریاضیات کا ہندوستان ویونان کے علم ریاضیات سے اس نے موازنہ بھی کیا ہے، وایک ابھی ادھیڑ ہی تھا کہ ناگہانی طور سے ۱۸۶۴ء میں وفات پائی،

جرمن مستشرقین میں جارج ہنری برنسٹین (J.H. Bernstein) کا نام بھی ہے، اس نے عربی زبان کی نحو پر ایک رسالہ لکھا، بعض قدیم عربی تصنیفات کو شائع کیا، ان میں ایک صفی الدین حلّی کا قصیدہ ہے، اس قصیدہ کو مع ترجمہ اور شرح کے برنسٹین نے چھاپا ہے، مشرقی مذاہب کے اصول پر ایک کتاب شائع کی، برنسٹین کو عربی سے زیادہ سریانی زبان سے واقفیت تھی، بروسلو میں سریانی زبان کا پروفیسر تھا، تہتّر برس کی عمر میں ۱۸۶۰ء میں وفات پائی،

جال اوگسٹ وولرس (J.A. Vullers) ڈی ساسی، کارٹرا اور فریٹاگ کا شاگرد تھا، جرمنی میں ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا، تقریباً ۱۸۷۰ء میں وفات پائی، گیسن کالج میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر تھا، فارسی زبان سے اس کو قدرتاً مناسبت تھی، ایک فارسی لاطینی لغت بھی اس کی تصنیف ہے، جو اب تک یورپ میں بہترین لغات میں شمار کیا جاتا ہے، فارسی شعراء اور مورخین کی متعدد یادگار کتابیں اس نے چھاپ کر شائع کیں، عربی زبان سے بھی اس کو واقفیت تھی، حارث بن حلزہ اور طرفہ کے معلقات مع شرح زوزنی شائع کئے، اور ان کا لاطینی میں ترجمہ کیا، عربی زبان کے اصول و قواعد پر ایک رسالہ لکھا،

فرانس اوگسٹ آرنلڈ (F.A. Arnold) کا بھی اس موقع پر نام لینا ضروری ہے، یہ جرمنی میں ہال کی درسگاہ کا پروفیسر تھا، دو جلدوں میں عرب مولفین کی مختصر تالیفات کا مجموعہ مشرقی

مدارس کے طلبہ کے لئے اس کی اہم یادگار ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۵۳ء میں طبع ہوا، یونانیوں نے بیت المقدس میں اس مجموعہ کا یونانی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا جدید اڈیشن شائع کیا۔ ۱۸۳۶ء میں آرنلڈ نے امرؤالقیس کا معلقہ مع شروح وحواشی اور ترجمہ لاطینی کے چھاپا۔

ڈاکٹر جان گٹفریڈ وٹزشٹین (J. G. Wetzstein) بھی جرمن مستشرقین میں داخل ہے۔ یہ جرمن قونصل کی حیثیت سے ایک مدت تک دمشق میں مقیم رہا تھا۔ مشرقی زبانوں کی تحصیل کا اس کو بیحد شوق تھا۔ دمشق میں اس نے قلمی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ ان کتابوں پر اس نے ایک ریویو لکھا اور ان کتابوں کو برلن بھیجا، حوران اور شام کی سیاحت کی، اور ان ملکوں کا سفرنامہ لکھا، زمخشری کی مقدمۃ الادب ۱۸۵۰ء میں لیپزگ سے چھاپ کر شائع کی۔

ہنری جوزف وٹزر (H. J. Wetzer) ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوا، جرمنی اور فرانس میں ڈی ساسی اور کارٹرمار سے السنۂ مشرقیہ کی تحصیل کی، فریبورگ کیتھولک کالج میں السنۂ مشرقیہ کا معلم مقرر ہوا۔ اس کالج میں اس نے اس قدر شہرت حاصل کی، کہ وہ علوم مشرقیہ کے طالبین کا مرجع بن گیا۔ مقریزی نے قبطی عیسائیوں کے جو حالات لکھے ہیں، وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، سال وفات ۱۸۵۳ء ہے۔

فلیپ وولف (P. H. Wolff) بھی ایک جرمن اورنیٹلسٹ ہے، جو عربی زبان کا جان دادہ تھا۔ اس نے مصر وشام وفلسطین کے سیاحوں کے لئے ایک رہنمانامہ (گائڈبک) لکھا ہے، اس میں عامی عربی زبان بھی جس کی ان ممالک کے سیاحوں کو ضرورت ہوتی ہے، شامل کر دی ہے، کلیلہ ودمنہ کا عربی سے جرمن زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا، معلقات کو جرمن ترجمہ کے ساتھ چھاپا، اور ان پر حواشی لکھے، وسط صدی ہجری کے مشہور شاعر ابوالفرج ببغا کے کلام کا ایک حصہ شائع کیا۔

جرمن مستشرقین! فہرست میں ہم آخری نام تھیوڈر ہاربروکر کا لیتے ہیں۔ یہ ہال کی درسگاہ کا پروفیسر تھا، شہرستانی کی کتاب الملل والنحل (تاریخ مذاہب) کا جس کو کورٹن نے لندن میں چھاپا تھا جرمن زبان میں ترجمہ کیا، اور اس پر نوٹ لکھے، محمد بن ابراہیم سخاوی کی مجمع العلوم (انسائیکلوپیڈیا) کو ۱۸۵۹ء میں چھاپا اور اس کے

ایک ریویو لکھا، بیت المقدس کے ایک یہودی کے عربی شروح توراۃ کو لاطینی ترجمہ کیا ساتھ چھاپ کر وقف عام کر دیا،
(الندوہ، نومبر ۱۹۱۱ء)

۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کے مستشرقین

آسٹریا | فرانس اور جرمنی کے بعد ہم آسٹریا کا نام لیتے ہیں، ان سنین میں آسٹریا میں صرف ایک شخص پیدا ہوا، جو مشرقیات میں ممتاز تھا، اور جس کو السنۂ مشرقیہ کے ساتھ فطری مناسبت تھی، اس کا نام بیرن جوزف دی ہامر پرگستال (J. D. Hammer Purgstall) تھا، ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا، وانا کالج میں السنۂ مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی، بیس برس کے سن سے پہلے ہی اس نے اتنی استعداد پیدا کر لی تھی، کہ عربی و فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں گفتگو اور بات چیت کرتا تھا، آسٹریا کی گورنمنٹ نے اس کو ترجمان کے عہدہ پر مقرر کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا، اور اپنے مشرقی کونسل خانوں کی افسری سپرد کی، بیرن جوزف نے اس تقریب سے مصر و شام کا سفر کیا، اور ان ملکوں کے حالات کی اطلاع بہم پہنچائی، مختلف مناصب جلیلہ حاصل کرنے کے بعد کونسل کا ممبر ہو گیا، اس کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گیا، بیرن غیر ملکی دس زبانوں سے واقف تھا، ہر قسم کے موضوعات پر اس نے کتابیں لکھیں، مضامین لکھے، لیکن اس کی علمی جد و جہد کا میدان زیادہ تر مشرقی ادب اور تاریخ رہا، ہم یہاں اس کی بعض تصنیفات کا حال لکھتے ہیں، اس نے اٹھارہ جلدوں میں حکومت عثمانیہ کی تاریخ لکھی، سات ضخیم جلدوں میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر عباسیوں کے آخر زمانہ تک کی تاریخ لکھی، جس میں اس نے ہزاروں مسلمان شعرا اور مصنفین کے حالات درج کئے ہیں، جرمن زبان میں امام غزالی کی کتاب ایہا الولد (اے فرزند)، علامہ زمخشری کی تصنیف قلائد الذہب اور ابن فارض کا قصیدۂ تائیہ کا ترجمہ کیا، عربوں کے فن موسیقی پر مضامین لکھے، الف لیلہ کی غیر معروف داستانوں کو شائع کیا، عرب شاعر خلف الاحمر کا دیوان چھاپا، متنبی کے دیوان کا تمام و کمال جرمن زبان میں ترجمہ کیا، ان کے علاوہ فارسی کی متعدد تصنیفات کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا، مشرقی علوم و فنون کے متعلق جو رسائل اس وقت نکلتے تھے، ان کی سرپرستی کی، بیرن موصوف کو عربی زبان سے اس قدر محبت تھی، کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر

عربی زبان میں نماز پڑھا کرتا تھا، ۱۸۵۶ء میں وفات پائی،

ہالینڈ | ہالینڈ گو یورپ کا ایک نہایت چھوٹا ملک ہے، لیکن مشرقی علوم وفنون کے ساتھ دلچسپی کے لحاظ سے یورپ کے کسی بڑے سے بڑے ملک سے کم نہیں ہے، موجودہ دور میں جو اورنیٹلسٹ پیدا ہوئے، ان میں سب سے زیادہ نامور تھیوڈر جان بول (G. J. Jugn boll) ہے، ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوا، عربی زبان میں اس کو کامل مہارت تھی، مشرق کی تاریخ اور اس کے لٹریچر سے اچھی طرح واقف تھا، متعدد مدارس میں عربی زبان کا معلم رہا، پھر لیڈن کالج میں پروفیسر ہوا، اور ۱۸۶۱ء تک جو اس کا سال وفات ہے، اس عہدہ پر سرفراز رہا، جان بول کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے متنبی اور اس کے معاصر شعراء کے ان تمام قصائد کا مجموعہ شائع کیا جو سیف الدولہ کی مدح میں کہے گئے تھے۔ ان کا لاطینی میں ترجمہ بھی شائع کیا، علامہ زمخشری کا جغرافیہ جو کتاب الجبال والامکنہ والمیاہ کے نام سے موسوم ہے، اس کو بھی شائع کیا، عربی جغرافیہ کی ایک اور کتاب مراصد الاطلاع علی الامکنۃ والبقاع کو بھی شائع کیا، جو علامہ سیوطی کے قلم سے یاقوت حموی کی مشہور جوگرفیکل انسائیکلوپیڈیا (معجم البلدان) کا خلاصہ ہے، ایک دوسرے مستشرق بنیامین ماٹس کی مدد سے کتاب النجوم الزاہرہ کو جو شاہان مصر وقاہرہ کی تاریخ ہے، چھاپا، اپنے دیگر ہم وطن اہل قلم کی شرکت سے شرقیات کے نام سے ایک مجموعہ چھاپ کر شائع کیا،

جان بول نے اپنے مرنے کے بعد ابراہیم ولیم جان بول (A. W. Jugn ball) ایک لائق فرزند بھی اپنی یادگار چھوڑا، جو مشرقی علوم میں اپنے باپ ہی کی طرح کامل دستگاہ رکھتا تھا، ابراہیم نے بڑی محنت سے ابو اسحاق شیرازی کی کتاب التنبیہ شائع کی، جو شافعی اصول فقہ کی ایک قدیم اور مستند تصنیف ہے، اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، اور اس پر مقدمہ وغیرہ کا اضافہ کیا، ۱۸۶۱ء میں ابن واضح یعقوبی کے جغرافیہ کی اشاعت کی جس کا نام کتاب البلدان ہے، سال وفات ۱۸۸۱ء ہے،

جان بول کا معاصر ہالینڈ میں ایک اور مستشرق تھا جس کا نام پروفیسر ٹاکوارڈا (F. Kanda) تھا، ۱۸۲۵ء سے پروفیسر موصوف نے مشرقی علوم وفنون کی خدمت شروع کی، مصر کی دولت طولونیہ کی تاریخ سے اس نے خاص دلچسپی ظاہر کی، ایک عربی گرامر کو مدون کیا، اور لاطینی میں اس کی شرح لکھی، جان بول کے

مجموعہ شرقیات کی تیاری میں یہ بھی اس کا برابر کا شریک تھا تقریباً ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔

ہالینڈ کے مستشرقین میں ہینڈریک وائرس (H. J. E. Weijers) بھی ایک مشہور مستشرق گذرا ہے۔ جان ایول کے مجموعہ شرقیات میں اس کا بھی حصہ ہے۔ وفیات الاعیان جو تاریخ ابن خلکان کے نام سے مشہور ہے، وائرس نے اس پر نہایت قابلانہ تبصرہ لکھا۔ اور اپنے ایک ہم وطن اور شاگرد ڈاکٹر مورسنگ کی معیت میں ابوالحسن بن عمر بن حبیب کی درۃ الاسلاک تاریخ اتراک کو شائع کیا کتب خانہ لیڈن کی قلمی کتابوں پر ریویو لکھا،

ڈاکٹر مورسنگ بھی جس کا ذکر اوپر گذرا، ایک قابل ذکر مستشرق تھا سیوطی کی طبقات المفسرین اسی نے چھاپ کر شائع کی ہے۔

انگریز | انگریزوں کو مشرقیات سے اور یورپین قوموں کے مقابلہ میں بہت ہی کم دلچسپی کم ہے، اس دور میں عربی زبان کے ماہرین کا وجود ان میں اور بھی بہت کم رہا۔ انگریز مستشرقین میں ہم سب سے پہلے ولیم کارٹون (W. Cureton) کا نام لیتے ہیں، ۱۸۰۸ء میں اس کی ولادت ہوئی۔ اور ۱۸۶۴ء میں لندن میں وفات پائی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، تمام مشرقی زبانوں میں اس کو سریانی زبان سے خاص دلچسپی تھی عربی زبان میں عیسائی مذہب کی تصنیفات کی اشاعت کے علاوہ اسلامی تصنیفات میں علامہ شہرستانی کی تاریخ مذاہب موسوم بہ ملل ونحل کو نہایت محنت وکوشش سے طبع کرانا شروع کیا، اور ۱۸۴۲ء میں لندن میں یہ کتاب مکمل چھپ گئی، دوسری کتاب علم کلام میں حافظ ابن نسفی کی تصنیف عمدۃ عقیدہ اہل السنہ شائع کی۔ یہ دونوں کتابیں ان مطبوعات کے ضمن میں شائع ہوئیں جن کو انگلینڈ کی شرکت تالیفات مشرقیہ (سوسائٹی فار دی پبلیکیشن اورینٹل ٹکسٹس) نے چھاپا ہے، اس سوسائٹی کا مشرقی تصنیفات کے طبع و اشاعت میں خاص حصہ ہے،

ہندوستان کی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کا ذکر بھی انگریزوں ہی کے کارناموں میں کرنا چاہیے، جس نے عربی زبان کی بہت سی کتابیں چھاپ کر دنیا میں پھیلائیں، میتھیو لومسڈن (M. Lumsden) اس سوسائٹی کا ایک سرگرم ممبر تھا جس کی کوشش سے مطبع کلکتہ کا وجود ہوا، اسی مطبع میں لومسڈن نے ۱۸۰۹ء

میں مقامات حریری۔ ۱۸۱۸ء میں احمد شروانی کی کتاب نفحۃ الیمن اور شرح معلقات زوزنی، مختصر معانی، قاموس فیروزآبادی وغیرہ چھپوائیں۔ لومسڈن کے بعد اسی دور میں ناسولیس (W Nassaulus) اس کا جانشین ہوا، لیس نے عربی زبان کی متعدد کتابیں شائع کیں جن میں مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں، ازدی بصری کی فتوح الشام، واقدی کی فتوح الشام، سیوطی کی تاریخ الخلفاء، محمد علی فاروقی تھانوی ہندی کی کشاف اصطلاحات الفنون دو ضخیم جلدوں میں، کشاف، ابن حجر عسقلانی کی نخبۃ الفکر و نزہۃ النظر، ان کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان کے علماء کے علاوہ اسپرنگر نامی ایک مستشرق بھی اس کا شریک تھا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ایک اور انگریز مستشرق کا نام بھی قابل ذکر ہے، ہارین جانسن (Hannas Jonees) جس نے گوتا سے ۱۸۵۸ء میں ابن عبدالحکیم مصری کی تاریخ فتح اندلس کو شائع کیا، اور اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

روس | تمام یورپ میں صرف روس ہی وہ ملک ہے، جہاں علم و تمدن نے ابھی کافی فروغ نہیں پایا ہے، اور اسی لئے انیسویں صدی کے وسط تک وہاں علوم مشرقیہ کی طرف لوگوں کو توجہ نہیں ہوئی، ایک زمانے کے بعد وہاں کے رایل اکاڈیمی نے اس کمی کو محسوس کیا، اور تلافی مافات پر آمادہ ہوئی، اکاڈیمی کی تحریک سے اور دوسری مشرقی انجمنوں کا وجود ہوا، اور مشرقی لٹریچر کی تحصیل و اشاعت کے آثار جابجا ظاہر ہونے لگے، اس دور میں حسب ذیل عربی تصنیفات روس سے شائع ہوئیں،

پروفیسر گاٹولڈ (J. M. E. Gathwaldt) نے قرآن مجید اور سبعہ معلقہ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی، جو قازان سے ۱۸۶۳ء میں چھپ کر نکلی، پیٹرسبرگ سے حمزہ اصفہانی کی تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء شائع کی، اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، ایک دوسرے روسی مستشرق پروفیسر کالسن (D. A. Cahoulson) نے عمر بن رستہ کا جغرافیہ موسوم بہ الاعلاق النفیسہ روسی زبان کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، ۱۸۵۹ء میں پیٹرس برگ کے رسالہ علمیہ کے متعدد نمبروں میں عربوں کے معلومات کے متعلق بہ بابل پر نہایت تحقیق سے مضامین لکھے، ایک اور روسی مستشرق کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، پروفیسر الگزنڈر کرسٹیانووٹس موصوف نے عربی علم موسیقی پر نہایت تحقیق سے مضمون لکھا، اور انہیں عربی آلات موسیقی کے فوٹو شائع کئے یہی مضمون

مع نوٹ کے ۱۸۶۳ء میں ایک علیحدہ رسالہ کی صورت میں کالونیا میں چھاپا گیا۔

ایک روسی مستشرق مقیم تبریز نے جس کا نام نیکولا خانیکوف (N. Khanikoff) ہے، خازنی کی مشہور تصنیف میزان الحکمۃ کو مع انگریزی رسالہ جرنل آف دی امریکن اورنٹیل سوسائٹی میں ۱۸۵۹ء میں چھپوا کر شائع کیا، خازنی کی یہ تصنیف علم الحیوانات، علم النباتات، علم الجمادات، علم المعدنیات اور علم الجواہر پہ عربی زبان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔

اسپین | اسپین کو اسلام، تاریخ اسلام اور عربی زبان سے جو شدید تعلق ہے، اس کا لازمی اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہاں سے عربی زبان کے ماہرین اور دوستوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوتی لیکن وہاں کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے جو شدید تعصب اور نفرت ہے، اس نے اجازت نہ دی کہ مسلمانوں کے علوم و فنون کے ساتھ ہمدردی کی جائے، لیکن جب یہ تعصب اور نفرت کم ہوئی تو چند نیک دل اس طرف متوجہ ہوئے، اس دور میں وہاں کے صرف ایک شخص کو ہم جانتے ہیں، اور وہ گاینگوس (De Gayangos) ہے جس نے اندلس کی سب سے مشہور عربی "تاریخ نفح الطیب" مقری کی دو جلدوں کا اسپینی زبان میں ترجمہ کیا، اندلس میں عربوں کی سب سے مشہور عمارت قصر حمرا کے حالات لکھے، اس کے پتھروں کے کتبے، ان کے حل اور فوٹو شائع کئے، اخلاق کی مشہور و معروف کتاب کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا، احمد بن محمد رازی کی تاریخ شائع کی۔

۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک

حسب سابق اس دور میں بھی فرانس کا نمبر اول ہے۔

فرانس | فرانس کا سب سے پہلا قابل ذکر مستشرق اس عہد میں کوسن ڈی پرسیوال (D. Perrival) ہے۔ ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۱ء میں وفات پائی۔ پرسیوال کو اپنی نوجوانی ہی سے مشرقیات کے ساتھ شغف تھا، گورنمنٹ فرانس نے اسی لئے اس کو ترجمان کی حیثیت سے قسطنطنیہ بھیجا، اور وہ پھر وہاں سے مصر آ گیا۔ تین سال تک ملک شام کی سیاحت کی، اس سیاحت کے دوران میں اس کو عربی زبان کی لغت دارجہ کی تکمیل کا موقع ملا، اور اس کی گرامر لکھی۔ اس کے بعد فرنچ گورنمنٹ نے اس کو اپنے سرکاری کالج

میں عربی کی پروفیسری کے لئے اس کو پیرس بلا لیا، اب اس کو تصنیف و تالیف کا کافی موقع ملا، اور اس موقع سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا، عرب قدیم کی تاریخ تین جلدوں میں ترتیب دی، یہ تاریخ اس نے ان تحقیق اور وسعت سے لکھی، کہ نہ اس سے پہلے ایسی لکھی گئی تھی، اور نہ اس کے بعد ایسی لکھی گئی، لوگوں نے اس کتاب کی اس قدر قدر کی، کہ اس کا پورا اڈیشن ختم ہوگیا، اور ایک ایک نسخہ سوا دو دو سو روپیہ میں بکا، اس کتاب کے علاوہ پرسیوال کی اور تصنیفات و رسائل بھی ہیں، جن میں سے ایک مشہور رسالہ عرب ماہرین موسیقی کے حالات میں ہے،

انہی دنوں میں ایک اور مستشرق بھی فرانس میں موجود تھا، جس کا نام لوئیس امالی سیدیو

. . . . . . ہے، اپنے باپ . . . . سے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، مشرقیات کی تعلیم حاصل کی، مشرقی کتب خانوں کی سیر کی، اور اپنے مذاق کی مادہ کتابیں طبع و اشاعت کے لئے بہم پہنچائیں، ان میں ایک کتاب ابو الحسن علی مراکشی کی علم آلات فلکیہ میں جامع المبادی والغایات شائع کی، اور اس کا فرنچ میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ فن ریاضیات میں احمد بن محمد سجاری اور امام مظفر السفرادی کے رسائل شائع کئے، یونانیوں اور عربوں کے فن ریاضیات کی ایک تاریخ لکھی، جس میں ان دونوں قوموں کی ریاضیات کا باہم موازنہ کیا، اور عربوں کو ترجیح دی، عربوں کی فتوحات اور علوم و فنون کی ایک ضخیم تاریخ لکھی، جس کا خلاصہ علی پاشا مبارک وزیر تعلیمات مصر نے عربی میں کرایا، اور اس کا نام خلاصۃ تاریخ العرب رکھا، عربوں کے ایجادات و اختراعات و مسائل کو مسیو سیدیو نے اپنی تصنیفات میں اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے، کہ دشمنوں کو یقین نہیں آتا، ۱۸۷۵ء میں وفات پائی

۱۸۰۰ء میں جول موہل، اسٹونگارٹ واقع جرمنی میں پیدا ہوا، اور فرانس میں مشرقی تعلیم حاصل کی، اور اسی تعلیم کی وجہ سے اس ملک سے اس کو ایسی دلچسپی پیدا ہوئی، کہ گویا وہ بالکل فرانسیسی ہوگیا، یوں تو اس نے مشرقیات کے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا، لیکن فارسی زبان کا اس کو زیادہ شوق تھا، پیرس سے فردوسی کا شاہنامہ سات جلدوں میں نہایت آب و تاب اور اہتمام سے چھاپا، اور اس کا فرنچ میں ترجمہ کیا، اور اس پر حواشی لکھے ۱۸۷۶ء میں وفات پائی،

۱۸۷۷ء میں ایک اور مستشرق گذرا ہے، جس کا نام مسیو بلین . . . . تھا،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کو پورا کیا۔

آخر میں فرانس کے پادری فرنسو بورگاڈ . . . . کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے ٹیونس میں کریچین مشنری کا کام شروع کیا. وہاں کی علمی حالت کو ترقی دی. عربی زبان کا [illegible] مطبع وہاں جاری کیا. عربی اخبارات شائع کئے. ٹیونس کی تاریخ لکھی. فتح بن خاقان کی قلائد العقیان [illegible] کی جو اندلس اور مغرب کے شعراء و ادباء کا تذکرہ ہے. سال وفات ۱۸۶۶ء ہے،

جرمنی | اس عہد میں جرمنی کے صرف دو مستشرقوں کا نام ہم کو معلوم ہے۔ ایک الوالڈ ہے گوتا میں ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا پہلے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ پھر السنہ مشرقیہ میں کمال حاصل کیا۔ عربی تصنیفات میں اس کی گرامر ہے، جو اس نے جرمن زبان میں دو حصوں میں لکھی۔ شعر اور عروض میں بھی اس کی ایک تصنیف ہے، قدیم عربی تصنیفات میں سے واقدی کی فتوح الجزیرہ شائع کی۔ اور گوتا کے قلمی عربی کتب خانہ پر تبصرہ لکھا۔ وفات ۱۸۷۵ء میں ہوئی،

دوسرا مستشرق ہارمن روڈیگر ہے جس نے السنہ مشرقیہ کا شوق اپنے باپ امائل روڈیگر سے وراثۃً پایا۔ مائل روڈیگر نے امثال لقمان اور توراۃ کا ترجمہ شائع کیا، ہارمن روڈیگر نے عربی زبان کی تکمیل کے بعد شہر ہال میں اس کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہوا، سب سے بڑا کارنامہ اس کا یہ ہے کہ اس نے ابو الفرج ابن الندیم کی کتاب الفہرست کے طبع و تصحیح کی طرف توجہ کی جس میں اس سے پہلے فلوگل نے ہاتھ ڈالا تھا لیکن طبع ہونے سے پہلے وہ مرگیا، ہارمن روڈیگر کے ساتھ اس کام میں اوگسٹ مولسر بھی شریک تھا۔ ان دونوں کی کوششوں سے یہ عجیب و غریب کتاب چھپ کر مکمل ہوئی۔ روڈیگر کی تصنیفات میں عربی زبان کے قواعد پر بھی بعض رسائل ہیں، ان میں سے ایک ضخیم رسالہ صرف بحث اسماء و افعال پر ہے،

روس | اس دور میں روسیوں کو السنہ مشرقیہ کی طرف زیادہ توجہ ہوئی جس میں عربی زبان بھی داخل ہے کیونکہ ان کو اس زمانہ میں مشرق سے بہت گہرا تعلق ہوگیا تھا۔ اور بہت سے مشرقی ممالک پر انھوں نے قبضہ کرلیا تھا، اس بنا پر ان کو روس میں ایک مشرقی درسگاہ قائم کرنی پڑی۔ اس درسگاہ میں عربی و فارسی زبان کی تعلیم کے لئے ڈی۔ ساسی کے دو شاگرد یعنی پروفیسر ڈیمانگ اور پروفیسر شر مائے طلب کئے گئے، شرمائے وہ ہے جس نے مغلوں اور کردوں کی بڑی ضخیم تاریخیں لکھی ہیں، ڈیمانگ کا شاگرد ڈوبجانوف تھا، جس نے ابوالعلا معری اور نابغہ کے قصائد شائع کئے۔

اسی زمانہ میں انگریز بولڈ ایریو بھی تھا۔ جس نے حارث بن حلزہ اور عنترہ کے معلقات شائع کئے، ان کے علاوہ عربی ادب کے اور منتخبات ماسکو میں ۱۸۲۲ء میں چھاپے۔ فارسی زبان سے اس کو کامل واقفیت تھی۔ بولڈ ایریو کا معاصر ایک اور روسی مستشرق تھا جس کا نام سیانکوو سکی

. . . . ہے، جس نے نوجوانی ہی میں عربی زبان حاصل کی تھی، پھر اس کو مصر وشام کی سیاحت کا موقع ملا، پٹرسبرگ آنے پر وہ عربی اور ترکی زبانوں کا پروفیسر ہوگیا، ان ملکوں کی سیاحت کی وجہ سے لغت دارجہ (عامی عربی) سے بھی واقف ہوگیا تھا، اس زبان میں چند مفید رسائل لکھے، دیوان لبید پر ایک عمدہ تبصرہ لکھا، سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا کہ ہوبی قبائل کے متعلق اور پولونیہ کے متعلق جو اس کا وطن تھا، عربوں، ترکوں اور ایرانیوں نے جو کچھ لکھا تھا، اس کو ایک کتاب میں جمع کیا،

۱۸۵۸ء میں پٹرسبرگ کالج میں مشرقی علوم کے لئے ایک خاص مدرسہ قائم کیا گیا، جس میں عربی زبان کی پروفیسری کے لئے نادر دوسکی . . . . بلایا گیا، ڈوسکی سے عربی زبان کی ایک گرامر یادگار ہے، جو اب تک علمائے روس کے لئے مرجع ہے،

روس کا ایک مشہور مستشرق الیاس نیولافٹس برازین . . . . تھا، جس کا سال پیدائش ۱۸۱۸ء ہے، قازان کالج میں السنۂ مشرقیہ کا پروفیسر تھا، پھر کالج کی طرف سے وہ بلادِ مشرقیہ کی سیاحت پر مامور ہوا، جس کے ضمن میں اس نے ایران، جزیرہ، ایشیائے کوچک، شام، مصر، قسطنطنیہ کریمیا اور سائبیریا کا سفر کیا، سائبیریا میں تاتاریوں کے آثار قدیمہ کی دریافت اور تحقیق کی، اور پھر ان کی تاریخ لکھی، جزیرہ اور مابین النہرین میں جو عربی زبان مستعمل ہے، اس کو حاصل کیا، اسلامی حکومتوں کی تاریخیں مرتب کیں، اور ان کے ضمن میں تاریخی جغرافی، اور لغوی مباحث حل کئے، اور ان کے آثار دریافت کئے، یزیدی اور اسماعیلی فرقوں کے حالات لکھے، قازان کے مشرقی مطبوعات پر ریویو لکھا، تقریباً ۱۸۷۰ء میں وفات پائی،

پروفیسر برازین کی طرح روس میں ایک اور مستشرق اس عہد میں تھا، جس نے ایران اور وسط ایشیا کا سفر کیا تھا، اس کا نام خانیکوف تھا، اس نے بخارا اور سمرقند کے آثار قدیمہ پر اور فارسی زبان اور فارسی شعرا پر رسائل لکھے ہیں، سال وفات ۱۸۷۹ء ہے،

آخر میں ایک نہایت جلیل القدر مستشرق نام لیتے ہیں، جرل ٹور بزگ ،

سال پیدائش ۱۸۰۷ء، پیرس میں ڈی ساسی سے تعلیم حاصل کی، اوپسا کالج میں عربی زبان کا پروفیسر تھا، عربی زبان پر اس کے بہت ہی گراں بہا احسانات ہیں، ابن اثیر کی مشہور تاریخ کامل کو چودہ[۱۴] جلدوں

میں شائع کیا۔ اور اس پر انڈکس وغیرہ کا اضافہ کیا، پھر فاس (مراکش) کی تاریخ موسوم بہ الانیس المطرب اور ابن ابی زرعہ کی روض القرطاس کو چھاپا، موخر الذکر کتاب کا لاطینی میں ترجمہ بھی کیا، ابن خلدون کی تاریخ اور ابن الوردی کے جغرافیہ کا انتخاب شائع کیا، اور شہر لیدن کے کتب خانہ میں عربی زبان کی جو قلمی کتابیں موجود تھیں ان پر تبصرہ لکھا، تقریباً ۱۸۶۵ء میں وفات پائی۔

(سید سلیمان ندوی، الندوہ مئی ۱۹۱۲ء)

اشاعت اسلام پر ایک جرمن کا لکچر

میسو مونٹیٹ سوئٹزرلینڈ کی جنیوا یونیورسٹی کے ایک مشہور پروفیسر ہیں، میسو موصوف نے پیرس کے فرانس کالج میں مختلف اسلامی مسائل پر فرنچ زبان میں سات لکچر دیئے تھے، یہ لکچر پیرس کے ۷۵ صفحہ کے ایک رسالہ میں شائع ہوئے ہیں، پہلا لکچر اشاعت اسلام پر ہے، دوسرا اصول اسلام اور اس میں جو بدعات اور دیگر مذاہب کے جو رسوم ورواج داخل ہوگئے ہیں، ان کے بیان میں ہیں، تیسرے لکچر میں اسلام کے اولیا اور بزرگان کرام کا تذکرہ ہے، چوتھا اسلامی تصوف، اس کے مختلف سلاسل اور صوفیہ پر ہے، پانچویں لکچر کا موضوع ایران کا جدید بابی فرقہ ہے، چھٹے میں اقوام اسلام کی آئندہ حالت کے متعلق پیشنگوئی کی گئی ہے، آخری لکچر میں میسو مونٹیٹ نے یورپ کو دنیائے اسلام کے ساتھ رابطۂ اتحاد مضبوط کرنے کی دعوت دی ہے، ہم ذیل میں ایک عربی رسالہ سے پہلے لکچر کا جو اشاعت اسلام پر ہے، خلاصہ درج کرتے ہیں،

"سید سلیمان ندوی"

مسلمان تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ان کی ایک کثیر تعداد جرمن، گریٹ، برٹین اور ہالینڈ کی حکومتوں کے ماتحت ہے، اور یہی وہ سلطنتیں ہیں جن کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے کیونکہ ان کے ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں، یہ مسلمان تین حصوں میں منقسم ہوسکتے ہیں، اہل ہند، اہل افریقہ، اہل ملایا (جزائر ہند)، اس وقت ہم کو خاص طور سے فرانس کے مقبوضات کے مسلمانوں کا تذکرہ مقصود ہے۔ ہندوستان، جاوا اور سماٹرا کے مسلمانوں کا ذکر ضمناً آئے گا۔

افریقہ کے بربری مسلمان فطری جذبات و عادات و اخلاق کے لحاظ سے ہندوستان، چین اور ملایا کے مسلمانوں سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے عیسائی مختلف ہیں۔
آبادی کے لحاظ سے تمام دنیائے اسلام کا اجمالی نقشہ یہ ہے مسلمان ایشیا اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ اور ملایا کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں، یورپ اور امریکہ میں بھی مسلمان باشندوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے تفصیلی مردم شماری کے لحاظ سے اس وقت تمام مسلمانوں کی مجموعی تعداد بیس کروڑ سے پچیس کروڑ تک ہے۔ فرانس کے ماتحت افریقہ کے مقبوضات میں ۲۲۳۱۸۰۰۰ مسلمان ہیں، انگلستان کے زیر حکومت ۰۰۰۰۰۰۸ ۶ کرور مسلمان ہیں، ہالینڈ میں حکومت کے تحت ۰۰۰۰۸۳۹۸۳ کرور مسلمان ہیں، ان میں تقریباً تین کرور جاوہ میں ہیں، چین میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ ہے، اسلامی ملکوں میں مصر کے سوا اور کسی ملک کے مسلمانوں کی صحیح تعداد ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، مصر میں ۰۰۰۹۶۲۰۱ مسلمان ہیں، مملکت عثمانیہ کے باشندے دو کروڑ چالیس لاکھ ہیں۔ ان میں زیادہ تر مسلمان ہیں، ایران میں ۹۰ لاکھ مسلمان ہیں، مراکش میں بھی کم و بیش مسلمانوں کی تعداد یہی ہے۔
اسلام دنیا کے جن ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، انہی میں محصور نہیں ہے، بلکہ جس طرح پانی سے لبریز ظروف سے پانی چھلک جاتا ہے، اسی طرح اسلام بھی اپنے خاص مسکن ظہور سے بہت آگے نکل گیا ہے،

اسلام ابتداء میں جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر جس سرعت سے دنیا میں پھیلا ہے اور پھیلتا جاتا ہے، اور اپنی اشاعت میں وہ جو کامیابی حاصل کر رہا ہے، وہ بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب کی تفصیل میں تمام مورخین سخت حیران ہیں، اور اس میں وہ مختلف الرائے بھی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سرعت کے ساتھ مذہب اسلام کی اشاعت کا سبب وہ مناسب وقت ہے جس میں وہ پیدا ہوا، اس وقت دنیا کی حالت ہی ایسی تھی، کہ جو مذہب بھی اس وقت پیدا ہوتا، اس کو حسن قبول حاصل ہوتا، بعض کہتے ہیں، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خلفائے راشدین کی طبیعت کی سادگی اسلام کی اشاعت کا سبب ہے، لیکن اسلام کی اشاعت کی سب سے بڑی ذریعہ اسلام کی سنگدلی، اور اس کی قوت شمشیر کو بتایا جاتا ہے، لیکن واقعات اس آخری رائے کی تکذیب کرتے ہیں،

لیکن حقیقت یہ ہے، کہ ان لوگوں نے اسلام کی اشاعت کے جو مختلف اسباب ہیں، ان پر صحیح طور سے

غور نہیں کیا،

ہمارے نزدیک اشاعت کے صرف دو قوی اسباب ہیں، اول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے پیروؤں کا اخلاص، اعتقادات، مذہب میں شدت، جوش جس نے چند ہی دن میں بت پرستی کا عرب سے خاتمہ کر دیا، اسلام ابتدائً اسرائیلی مذاہب کی طرح صرف ایک مذہبی اصلاح یا تجدید کی تحریک سے عبارت تھا، لیکن مکہ سے جب مدینہ اس کا ذکر منتقل ہوا، تو اس میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا یعنی وطنیت اور قومیت کا احساس، یہ اسلام کی اشاعت کا دوسرا سبب ہے، اسی بنا پر اسلام میں، مذہب تمدن، اور پالیٹکس ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں، جس کا جلوہ اسلامی تمدن میں نہایت صاف طریقہ سے نظر آتا ہے، اور انہی تینوں کا اجتماع اس کی اشاعت اور ترقی کا باعث ہوا، اور بعض لوگوں کا بیان ہے، کہ یہی اجتماع اس کے انحطاط و زوال کا بھی سبب ہے،

اس حقیقت کے جاننے کے بعد مناسب ہے، کہ ہم مذہب، اسلام کی ہدایات اور قرآن کے مواعظ و حکم کی فتوحات کا اس کے جنگی و فوجی فتوحات سے الگ تصور کریں، مذہب کی اشاعت و ترقی عموماً پالیٹکس کے ذریعہ ہوتی ہے، جس کو تاریخ کا ہر واقف کار اچھی طرح جانتا ہے۔ لوتھر اور کالون کے ذریعہ مسیحی مذہب میں جو اصلاح اور ریفارم ہوا ہے، اس کے مورخین شہادت دیں گے، کہ پالیٹکس کو پروٹسٹنٹ مذہب کی اشاعت میں کس قدر قوی دخل ہے، سولھویں صدی کے ریفارمر اور مصلحین یعنی لوتھر اور کالون کے تمام معاصرین بہت صاف وجدان و احساس اور اعلیٰ خیالات کے حامل تھے، لیکن پھر بھی سیاست کی موجوں نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا، بابی مذہب کی اشاعت کی تاریخ میں بھی اس کی مثال موجود ہے، کہ روحانی ترقی کو مادی ترقی سے یا مذہب کو پالیٹکس سے کس قدر شدید تعلق ہے،

اسلام کی سرعت اشاعت کے اسباب کے بیان میں لوگوں نے بہت تکلف سے کام لیا ہے، اور ہم نے مذہب کی اشاعت کا جو طریقہ بیان کیا ہے، وہ ہر انسانی سوسائٹی میں ظاہر ہے، لیکن انھوں نے اس سے قطع نظر کیا ہے، اور بتایا ہے، کہ چونکہ ملک عرب بہت تنگ تھا جس کی وسعت یورپ کے تین ثلث کے برابر ہے، جب وہاں انقلاب آیا، تو وہاں کے لوگوں کو اضطراری طور پر اپنے ملک سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیلنا پڑا، اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی اشاعت بھی لازم تھی، وہ جہاں جہاں گئے، اپنے ساتھ اسلام کو بھی لے گئے۔

ہم نے اسلام کی اشاعت کے اسباب کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے، ہمارے نزدیک اشاعت اسلام کے فوری اسباب دینی دو ہیں، جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، یعنی مسلمانوں کا اخلاص اور شدت اعتقاد، لیکن آج کل بیسویں صدی میں اسلام کی اشاعت میں مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی اسباب بھی شامل ہیں، مذہبی اسباب پر غور کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ کیا اشاعت اسلام کے لئے مسیحی مشنریوں کی طرح کوئی طریقہ موجود ہے؟ اس کا جواب ہاں اور نہیں دونوں ہے، افریقہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ صحیح اور حقیقی طریقہ سے اسلامی مشنری کی خدمت انجام دے رہا ہے، اس نے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جن کا لازمی اثر یہ ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت ہو، علاوہ بریں اسلام خود بخود افریقہ میں پھیل رہا ہے کیونکہ بت پرست ممالک میں ہر مسلمان کا وجود بجائے خود داعی الی الاسلام ہے، اسلام کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے عقائد پر چھا جاتا ہے، تاجران اسلام جو افریقہ میں آتے جاتے ہیں، وہ بھی اشاعت اسلام میں مستحکم ذریعہ ہیں، حمیت، غیرت اور جوش سے متصف مبلغین اسلام، قبائل اور ممالک کے مناسب حال اقتصادی اور معاشرتی تدابیر بھی اختیار کرتے ہیں،

افریقہ کے بعض مقامات میں نومسلموں کے لئے مسلمان مشنریوں نے بہت سے گاؤں آباد کئے ہیں، مسلمان مشنری افریقہ میں قحط سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، جب کہ زنجبار کے ساحل پر وانکیا میں واقعہ گذرا، ایسے موقع پر وہ اسلام کو نیکی اور احسان کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اکثر یہ بھی ہوا کہ مسلمان مشنریوں نے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا کہ وہ جہاں جائیں، اسلام پھیلائیں، طرابلس الغرب اور مصر کے حدود میں وادائی کے غلاموں کو گاؤں والے لوٹا کرتے تھے، محمد بن علی سنوسی نے ان کو خرید لیا، اپنی خانقاہ میں ان کو اسلام کی تعلیم دی، اور جب یہ یقین ہوگیا کہ یہ لوگ اشاعت اسلام کی خدمت باحسن وجوہ ادا کرسکتے ہیں، تو ان غلاموں کو آزاد کر کے ان کے وطن اصلی میں واپس کر دیا، تاکہ وہ مذہب اسلام کی وہاں اشاعت کرسکیں،

دوسرے متمدن ممالک و اقوام میں مسلمان مشنری دوسری تدبیریں اختیار کرتے ہیں، اپنی اعلیٰ تعلیم سے وہ اپنے حکام اور افسروں کو رضامند کرتے ہیں، اور عام ہر دلعزیزی حاصل کرتے ہیں، اس ملک یا قوم کے مانوس رسوم و عادات سے سکوت کرتے ہیں، ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے، غلط مذہبی تخیلات اور مذہبی تہواروں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں، اس طرح اس قوم کے افراد کو اسلام بظاہر کوئی نیا مذہب نہیں معلوم ہوتا، اور وہ اس میں رفتہ

رفتہ جذب ہوجاتے ہیں چین کے مسلمانوں کا یہی حال ہے، ان کے لئے گورنمنٹ کی طرف ہر قسم کی راہیں کھلی اور سہولتیں حاصل ہیں، وہ اپنی مسجدوں کی عمارتیں، خاص چینیوں کی عبادت گاہوں سے بلند نہیں بناتے، اسی لئے منارہ جو مساجد کی علامت ہے چینی مساجد میں نہیں ہوتا، چینی مسلمان اپنے ہم مذہبوں کو وصیت کرتے ہیں، کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے مذہبی تہواروں سے کنارہ کش نہ ہوں۔ چینی مسلمان جب عام ملکی فرائض ادا کرتے ہیں، تو بعض ان غیر اسلامی مذہبی فرائض کو بھی ادا کرتے ہیں جن کو قانون ملکی نے ان پر واجب کر دیا، اس کے باوجود جب وہ روشن خیال اور مہذب غیر اہل مذہب سے گفتگو کرتے ہیں، تو اسلام کو فطری مذہب کی صورت میں ان عادات و رسوم سے پاک کر کے پیش کرتے ہیں، جو چین میں کنفیوشش مذہب کی ہمسائگی سے اس میں پیدا ہو گئے ہیں،

مدارس بھی اسلام کی اشاعت کے مستحکم وسائل ہیں، مسلمان جب کسی سرزمین پر اقامت کرتے ہیں، تو سب سے پہلے وہ اپنی عبادت گاہ تعمیر کرتے ہیں، جس کے پہلو میں ایک بچوں کا مکتب بھی ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ افریقہ میں مسلمانوں کے بچے دوسرے بچوں سے بہتر حالت میں ہوتے ہیں، جس کو دیکھ کر وہاں کے دیسی باشندوں کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے، کہ وہ اپنے بچوں کو ان مکاتب میں بھیجیں،

عورتوں کے ذریعہ سے بھی اشاعت اسلام ہوتی ہے، دریائے نیل سے ملک حبش کے شمالی ممالک میں بجہ قبائل پھیلے ہوئے ہیں، ان کی عورتیں، مردوں سے زیادہ عاقل اور تیز فہم ہوتی ہیں، سنوسی مسلمان مشنری ان اطراف میں اشاعت اسلام کے لئے عورتوں ہی کو پسند کرتے ہیں، اور ان کو تعلیم دیتے ہیں، حالانکہ اغلباً اسلامی ممالک میں عورتوں کی تعلیم کم رائج ہے، یہی طریقہ مسلمان مشنریوں نے ٹوبو میں اختیار کیا، جہاں وہ زنگی عورتوں کو تعلیم دے کر ان سے اشاعت اسلام کی خدمت لیتے ہیں، اسلام کی اشاعت مناکحت اور ازدواج سے بھی ہو رہی ہے۔

- اسلام کی اشاعت بت پرست اقوام کی اولاد کی خریداری سے بھی ہوتی ہے، ان کو مذہب اسلام کے موافق تعلیم دی جاتی ہے، چین میں مشاہدہ ہوا کہ پرجوش مسلمانوں نے شانگ ٹونگ کے ہیبت ناک قحط کے زمانہ میں دس ہزار بچوں کو خرید لیا، اسلامی تعلیم و تربیت نے ان بچوں کو مسلمان گھرانوں میں بدل دیا،

اقتصادی اور معاشرتی حیثیت سے ہم جب اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں، کہ اسلام عیسائیت

کی طرح اپنے قدیم تمدن سے خالی نہیں۔ یہ وہ تمدن ہے، جو اکثر ممالک میں پھیلا اور مشرق و مغرب میں اوج، عظمت و جلال کو پہونچا۔ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں یہ تمدن عام ممالک میں عموماً اور افریقہ میں خصوصاً ایک قوی تر قوت تھا، اسلام کا تمدن اب انحطاط پذیر ہو چکا ہے، مگر معدوم نہیں ہوا ہے، افریقہ میں اسلامی تمدن، انتظامی اقتصادی، معاشرتی، [illegible] اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے افریقہ کے نہایت مناسب حال ہے، ایک محقق کا قول ہے کہ

"جب ہم ان [illegible] افریقہ میں عیسائیت اور اسلام کی اشاعت سے پیدا ہوئے، باہم مقابلہ کرتے ہیں، تو صاف نظر آتا ہے، کہ تمدنی حیثیت سے اور عقلی، اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے اسلام، عیسائیت سے فائق ہے"۔

عام افریقی اور خاص زنگی قبائل میں اسلام کو کامیابی اس لئے بھی ہوئی، کہ اسلام کے بعض معاشرتی قوانین مثلاً تعدد ازدواج، غلامی اور سادگی، ان قبائل کے زیادہ حسب حال ہیں، سادگی اسلام کی ایسی قوت ہے جس کے ذریعہ دیگر قومیں اسلام میں بہت جلد جذب ہو جاتی ہیں، اسی سادگی کی وجہ سے قوت شجاعت اور ارادہ پیدا ہوتا ہے، یہ وہی قوت ہے، جس کو افریقہ اور یورپ میں اہل نظر مسیحی ڈھونڈھا کرتے ہیں،

افریقہ میں اشاعت اسلام کا سبب پالٹکس بھی ہے۔ افراد و قبائل چاہتے ہیں، کہ اسلام کے ذریعہ سے وہ اپنے سیاسی مرکز کی حفاظت کریں۔ اور ایک زندہ ترقی یافتہ طرز معاشرت اور مستقل اور خود مختار حکومتیں اور ریاستیں قائم کریں، کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں مذہب کے ساتھ انتظام ملکی اور حکومت سازی کی بھی قابلیت ہے، مغربی اور درمیانی افریقہ کے بہت سے شہروں میں اسلام کی اشاعت اسی وجہ سے ہوئی، افریقہ کے مشہور پالٹیشین امامی ساموری کی لائف ہمارے اس دعویٰ پر دلیل بین ہے،

ساموری، کانکن شہر میں قابض ہونے سے پہلے سیاسی اغراض کی بنا پر اپنا مذہب تبدیل کرتا رہا، ابتدا وہ بت پرست تھا، جب وہ ایک مسلمان پالٹیشین صوری ابراہیما سے ملا، جو کوبنا، کانکوما، ٹور کاٹو، کاماڈو اور کو کے شہروں پر محیط سلطنت ٹیڈین کا بانی تھا۔ تو وہ مسلمان ہو گیا، کچھ عرصہ بعد وہ پھر بت پرست ہو گیا، جب کوبنا کی جنگ چھڑی تو وہ پھر مسلمان ہو گیا، اور مجاہد اسلام دیالومن فاتح جالون اور ایک دوسرے مسلمان فاتح عثمان قادری کے طریقہ پر چلنے لگا، اسی وقت سے ساموری کے تمام حملوں میں فاتح عثمان، ساموری کا دست و بازو رہا، اور اسی کی تحریک سے ساموری کو امامی کا لقب دیا گیا،

اسلام کے اس سیاسی طریقۂ اشاعت کا اس دن خاتمہ ہوگیا، جس دن دول یورپ نے افریقہ کو باہم تقسیم کرلیا۔ اس کے بعد زنگیوں کو مسلمان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی بعض قبائل جو سیاسی غرض سے مسلمان ہوچکے تھے، وہ یورپین قبضہ کے بعد پھر اپنے آبائی مذہب میں واپس آگئے، اس کی مثال قبیلۂ قیس ہے، جو سونیکے مارکا کی اصل سے تھا مسلمان ہوگیا تھا۔ اور ۱۸۳ء کے قریب قریب زمانہ میں باماکو کے شمالی اطراف میں سکونت گزیں ہوگیا تھا۔ اسلام میں غلامی بھی جائز ہے۔ اس لئے اس نومسلم گروہ کو غلاموں کی امداد سے کاشتکاری میں بڑا فائدہ حاصل ہوا، اور وہ مالا مال ہوگیا۔ فرانسیسی اس ملک پر قابض ہوئے تو ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء میں انھوں نے غلامی کا طریقہ بالکل اٹھادیا، غلام آزاد ہوکر اپنے وطن چلے گئے، تو مذکورہ قبیلہ کو شہروں کی سکونت چھوڑ کر گاؤں میں آباد ہونا پڑا اور کاشتکاری کرنی پڑی، ان میں سے اکثر بت پرست ہوگئے۔ ارتداد کی اور مثالیں بھی ہیں۔

بظاہر آج کل اشاعت اسلام کے عام ملکی وسیاسی وجوہ ناپید ہیں، لیکن مقامی سیاسی اسباب اب بھی موجود ہیں، جس کی علت یہ ہے، کہ اسلام طبعاً اپنے پیروؤں کو خودداری اور سیاسی خودمختاری کی تعلیم دیتا ہے، مسلمان اکثر مسافرانہ وارد ہوتے ہیں، چونکہ کثیر التعداد ہوتے ہیں، اس لئے ان کو افریقہ کے قبائل پر اقتدار حاصل ہوجاتا ہے، اور پھر وہ کسی کی حکومت برضامندی نہیں قبول کرتے اور یہ امر اس پر دلیل ہے۔ کہ اسلام بحیثیت مذہب اور بحیثیت تمدن رتبۃً اعلیٰ ہے۔

گزشتہ واقعات اور تعداد مردم شماری اور اشاعت اسلام کے اسباب کی تفصیل کا اجمالی نتیجہ یہ ہے کہ اس مذہب میں اشاعت اور ترقی کی قوت موجود ہے، اور دائی مذاہب میں اس کو ایک بلند درجہ حاصل ہے، اسلام سے ارتداد کی مثالیں شاذ و نادر ہیں، اور بعید نہیں کہ آئندہ اسلام کی تاریخ اشاعت میں ایسے واقعات پیدا ہوں جن کی وجہ سے اس کو غیر معمولی اور فوق العادت اشاعت و ترقی ہو اور کرۂ عالم کے بعض اطراف میں یہ ناگہانی حملہ آور ہو۔ ظاہری حالات آئندہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ یقینی ہے کہ اسلام کا سیلاب ترقی مذہبی حیثیت سے روز بروز اور زیادہ طوفان خیز ہوگا، اور اس کی رو دور دراز ممالک میں پھیلتی جائے گی،

تاریخ میں مذکور ہے کہ عقبہ بن نافع ایک اسلامی سپہ سالار جب اپنی فوج کے ساتھ ۶۲ھ میں مغرب اقصیٰ کو فتح کرکے مراکو سے آگے بڑھا اور بحر ظلمات (اٹلانٹک) کے ساحل پر پہنچا، تو جوش میں اس نے گھوڑا سمندر میں

ڈال دیا، اور جب سمندر کی موجیں گھوڑے کے سینہ تک پہونچیں، تو افسوس اور حسرت کے لہجہ میں اسلامی سپہ سالار کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "خدایا اگر سمندر کی لہریں میرے گھوڑے کی رفتار کو سست نہ کر دیتیں، تو میں سمندر کے اس پار اسی طرح دور دراز ممالک میں تیرے نام کی تقدیس کرتا ہوا چلا جاتا؛ آج یہ بہادر زندہ ہوتا، تو دیکھتا کہ اسلام اس کے ارادہ اور حوصلہ سے زیادہ دنیا کو فتح کر چکا ہے، اور وہ اس تاریک سمندر کو طے کر کے محمدؐ کا پیغام تمام دنیا تک پہونچا چکا ہے،

(الندوہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

مستشرقینِ یورپ
اور
محبتِ الٰہی اور اسلام

منجملہ ان اعتراضات کے جو نہایت فخر وغرور اور طعن وطنز کے ساتھ ۔ مسیحی مبلغین اور یورپین مستشرقین اسلام پر کیا کرتے ہیں، ایک یہ ہے، کہ اسلام نے خدا کا جو تخیل اپنے پیروں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ، وہ ایک جبار، قہار، پر غضب، صاحبِ جلال وجبروت شہنشاہ ہے، جس سے ہمیشہ بندوں کو ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیئے، اور اسی کا اثر اس کے تمام احکام میں نمایاں ہے، برخلاف اس کے عیسائی مذہب اس کو محبت، پیار، رحمت اور شفقت کے پیکر میں جلوہ گر کرتا ہے، اور اسی لئے اس کو باپ کے نام سے پکارتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے، کہ اس کی نصیحتوں میں نرمی اور رحم وکرم کا جذبہ غالب ہے۔

مستشرقین اس اعتراض کو اسی صورت میں پیش کرتے ہیں، کہ چونکہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے، اس لئے اس کے تخیل میں خدا کی جباری وقہاری اور غیظ وغضب کا تصور سب سے زیادہ ہے، اور اسلام کی یہی کمی تھی جس کو تصوف نے آکر پورا کیا، اور بجائے اسکے کہ فقہاء کی طرح خدا کی اطاعت کا مبنیٰ خشیت اور خوفِ الٰہی کو قرار دیا جائے، انھوں نے خدا کے عشق ومحبت کو قرار دیا۔

ناآشنایانِ اسلام کو اسلام کے متعلق بحث وکاوش کرتے ہوئے یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے، کہ وہ محض تخیلی اور خیال آرا مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ اس عملی دنیا کا عملی مذہب ہے، دنیا میں کروروں انسان ہیں، ہر انسان کے پیچھے ہزاروں کام ہیں، اور انسان کے ہر کام کا تعلق دوسرے انسان سے ہے، ان انسانوں میں کوئی باہمی تعلق ایسا ہونا چاہیئے، جو ایک کو دوسرے سے پیوستہ کردے، ایک کو دوسرے کی طرف جھکادے، ایک کا رشتہ دوسرے کے ساتھ جوڑدے، اس تعلق، اس پیوستگی اور اس رشتہ کو جو چیز پیدا کرتی اور قائم رکھتی ہے، وہ محبت اور خوف کا جذبہ ہے اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے، کہ وہ نفع کی طرف رغبت اور ضرر سے نفرت ہے،

غرض انسان کی تمام تحریکات کا سرِ بنیاد محبت وخوف اور رغبت نفع ونفرت ضرر ہے۔ خدا اور اس کے

صفات کے متعلق انسان کے جو خیالات اور تصورات ہیں، وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں، وحشی اقوام کے مذہبی خیالات پر غور کرو، تو معلوم ہوگا، کہ وہ مناظر و موجودات فطرت کی پرستش اسی اصول کے مطابق کرتے ہیں، بعض چیزوں سے وہ ڈرتے ہیں، تو وہ ان کی پوجا کرتے ہیں، کہ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں، بعض دوسری اشیا کے لطف و کرم کے متوقع ہوتے ہیں، کہ وہ ان کے منافع سے بہرہ اندوز ہو سکیں،

اب عام انسانی معاملات اور کاروبار پر غور کرو، کہ انسان کی موجودہ فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے، کہ دنیا کا یہ نظام صرف محبت اور رغبت کے جذبات سے چل سکے، اگر ایک دن بھی دنیا کے بازاروں، سلطنتوں کے دفاتر اور قوموں اور جماعتوں کی مجلسوں اور سوسائٹیوں میں تنہا اس پر عمل ہو، تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے، اور اطاعت و فرماں بری کا جس پر تنظیم اور ضابطہ و قانون (ڈسپلن) کا دارومدار ہے، خاتمہ ہو جائے، اسی طرح اگر صرف نفرت و عداوت اور خوف و خشیت تمام تر عالم کے کاروبار میں دخیل ہو جائے، تو یہ دنیا جہنم بن جائے، اور دلوں کی شگفتگی اور انبساط جو ہماری سرگرمیوں اور ولولوں کا مایۂ حیات ہے، دفعۃً فنا ہو جائے، اس لئے دنیا کا نظام ان دوگونہ جذبات کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، اور انسان اپنے ہر عمل میں ان دونوں کے سہارے کا محتاج ہے،

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے، ان میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی، اور صراط مستقیم سے وہ تمامتر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سر تا پا خوف، خشیت، اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا "فوجوں کا سپہ سالار" اور باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا، یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر شاذ و نادر کہیں نظر آئے گا، اس کے برعکس عیسائیت تمامتر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور ہے، اس کے اکلوتے بیٹے کا باپ "تمام انسانوں کا باپ" ہے، وہ اپنے "فرزندوں" کے جرم و خطا سے غضب ناک نہیں، بلکہ پشیمان اور متاسف ہوتا ہے،

افراط و تفریط کا نتیجہ یہ ہے کہ یہودیت ایک خشک اور بے لذت مذہب بن گیا اور عیسائیت اس قدر تر ہے، کہ تر دامنی اس کے نزدیک عیب نہیں، ایک گنہ گار عورت کو یہودیت سنگسار کرنے کا حکم دیتی ہے لیکن عیسائیت صرف اسی قدر کہتی ہے، کہ "جو گنہ گار نہ ہو، وہ اس عورت کو پتھر مارے، اور اے عورت! جا، پھر ایسا نہ کرنا" اسلام

تفصیل کرتا ہے، مجبور، و مجنون و مدہوش وغیرہ مستثنیٰ ہیں، بے شوہر عورت، اور بن بیوی کے مرد کو کوڑے مارے جائیں، شوہر والی عورت، اور بیوی والا مرد سنگسار ہوگا، یہودی مذہب کسی بازپرس کے بغیر ہر حال میں مرد کو طلاق کی اجازت دیتا ہے، ملت عیسوی کسی حال میں طلاق کا فتویٰ جاری نہیں کرتا، اسلام اس کے متعلق تفصیلی احکام رکھتا ہے، غرض یہی حال اسلام کا تمام دیگر مسائل میں ہے، کہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے درمیان ہمیشہ بیچ کی راہ اختیار کرتا ہے۔

یہی حال اعتقادیات کا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج، اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کا خدا مانتا ہے، اور نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا باپ سمجھتا ہے، اور تنہا رحم وکرم اور محبت وشفقت کے صفات سے متصف کرتا ہے، وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے، کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے۔ اور رحمان وکریم بھی ہے، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، اور غفور ورحیم بھی ہے، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے۔ اور پیار بھی کرتا ہے، بگاڑتا بھی ہے، اور نوازتا بھی ہے، نفع اور نقصان دونوں اسی کے ہاتھ میں ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہئے،

کسی حسین اور محبوب چیز کی نسبت اگر اس کے عاشقوں اور محبت کرنے والوں سے پوچھا جائے، کہ اس کی کون سی ادا تم کو پسند آئی، اس کے کس حصہ میں تم کو حسن وجمال کا مظہر نظر آتا ہے، اس کے کس حسن وخوبی نے تم کو فریفتہ کیا ہے، تو یقیناً پوری جماعت کا ایک ہی جواب نہ ہوگا، کوئی کسی حصہ کا نام لے گا، کوئی کسی ادا کی تعریف کرے گا، کوئی کسی خوبی کا اپنے کو شیدا بتائے گا، اسی طرح دنیا میں جو پیغمبر آئے، وہ کئی قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے خدا کے صرف جلال وکبریائی کا جلوہ تھا، اور اس لئے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوح اور حضرت موسیٰ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگوں کو اسی خم خانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ،

لیکن پیغمبروں میں ایک ہستی تھی، جو برزخ کبریٰ، مجمع کمال اور جامع مستی وسرشاری وہوشیاری تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک آلود رہتی تھیں، دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم سے مسرور تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر لوگوں کو نظر آجاتے، چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں،

آتیں گذرتی جاتیں، جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی، پناہ مانگتے، اور جب کوئی سرو محبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی، تو اس کے حصول کی دعا مانگتے[1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے، کہ خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لئے کہا گیا ہے، الایمان بین الخوف والرجا، ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف خدا کے رحم وکرم سے ناامید بنا دیتا ہے، اور محض رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں ہم کو تم کو سب کو نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے عملاً اس کے نتائج کا مشاہدہ یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، ایک ناامید محض اور دوسرا سرتاپا امید ہے،

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو "فرزند الٰہی" کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو نانواز خدا اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰ کے جوڑ پر حضرت عزیر کو "فرزند الٰہی" کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا،

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (مائدہ)	ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں،

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۔ (مائدہ)	اگر ایسا ہے، تو خدا تم کو تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ،	اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں

[1] مسند ابن حنبل، ج ۶، ص ۹۲،

(رحمٰن) نہیں کرتے، اگر تم سچے ہو،

اسلام رحمت الٰہی کے تنگ دائرہ کو کسی خاندان، اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی، کہ "خدایا مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر" آپ نے فرمایا، "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا"[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرمایا "یہ زیادہ گمراہ ہے، یا اس کا اونٹ"[2]

اسلام کے متعلق عیسائیوں نے جو یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے، کہ اس کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے، اس غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ اسلام عیسائیت کی اس اصطلاح اور طرز ادا کو سخت ناپسند کرتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ خدا کے ان اوصاف کو نمایاں کرتی ہے، یعنی باپ اور بیٹے کا لفظ کہ اس سے گمراہی پھیلتی ہے، یہ گمراہی کچھ عیسائیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اور دوسرے فرقے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں،

اصل یہ ہے کہ خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو یہ فرقے اپنی بولی میں نمایاں کرنا چاہتے ہیں، یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض کوتاہ اندیش فرقوں نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کو ظاہر کرنے کے بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا، اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا جاتا ہے، سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں،

دیکھو یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، وہ کس قدر راہ سے بھٹک گئے، اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا، اور لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے، اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا، ان جسمانی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، [2] ابوداؤد، کتاب الادب،

اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے، اور ان سے بھی زیادہ کا طالب ہے،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ	تو خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اپنے باپوں کو
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ)	یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو،

بہرحال رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا، کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، ان کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کے لئے ان کے لغت کا کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو اس غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے، اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے، اس "ان دیکھی ہستی" کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو، ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا، کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیرووں کے گردوپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے، لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے، کہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کردے، جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ، ماں، اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے، کہ اس تخیل کے معتقد نا ممکن ہے، کہ خالص توحید کی صراط مستقیم پر قائم رہ سکیں، اس لئے اسلام نے یہ کیا، کہ ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کردیا، بلکہ ان کا استعمال بھی شرک و کفر قرار دیا، تاہم چونکہ حقائق روحانی یہ تنہا بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرتا ہے، اس لئے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے ان جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لئے مستعار

لے لیا، جن کا اظہار دوسرے مذاہب نے ان رشتوں کے ذریعہ کرنا چاہا تھا، اور اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر ربط و تعلق کا اظہار اس نے کیا، اور انسانوں کو استعمالات کی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں، ان سے ان کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے، اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے ہیں، ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے، جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز وصف ہو سکتی تھی۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ "اللہ" ہے، "اللہ" کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے، اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے، کہ یہ ولاہ سے نکلا ہے، ولاہ اور ولہ کے اصل معنی عربی میں اس غم، محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے، اس لئے "اللہ" کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی، قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں من موہن یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے، وہ رحمان اور رحیم ہے، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں، یعنی رحم والا مہربان، لطف و کرم والا، اور پھر یہی اوصاف قرآن مجید کے ہر سورۃ کے آغاز میں پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل مطلوب ہے، لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علم بھی لفظ رحمان ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا لفظ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بیسیوں اوصافی نام ہیں، احادیث میں اس کے ننانوے نام گنائے گئے ہیں، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، لیکن استقصا کرو تو معلوم ہوگا، کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا

ایک نام یا ایک وصف "الودود" (سورۂ ذات البروج) آیا ہے، جس کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق و پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام "الولی" ہے، جس کے لفظی معنی یار اور دوست کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ "الرؤف" ہے، رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں، جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کے لئے قرآن مجید میں ایک اور نام "الحنّان" ہے، جو حن سے مشتق ہے، حن اور حنین اس سوزدل اور محبت کو کہتے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعارانہ معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اس نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں،

ان کے علاوہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات مذکور ہیں، ان کو بھی اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کا نام غفّار (بخشش کرنے والا) غفور (بخشنے والا) سلام (امن و سلامتی) ہے، کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لئے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوہّاب (عطا کرنے والا)، الحلیم (بردبار)، الصبور (بندوں کی گناہوں پر صبر کرنے والا)، التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا)، البرّ (نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے،

تورات کے اسفار اور انجیل کے صحیفوں کا ایک ایک ورق ڈھونڈو، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ پُرمحبت یہ سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی، اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس لطف و کرم اور مہر و محبت کے جذبات و عواطف سے وہ بے بہرہ نہیں، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ روحانی سمجھتے ہیں، مگر بات یہ ہے، کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے، جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معانی کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لئے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں،

اسلام متکلم ازل کا آخری پیغام ہے، اس لئے ضرورت تھی، کہ وہ اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو، حقائق

حقائق روحانی کی تعبیر کے لئے یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی مذہب کا یہ فرض ہے، کہ وہ اپنی تعلیم کو ان استعمالات کی غلطیوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے، اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کر دیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ وہ انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا، کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے رب کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں، بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے،

اب اور رب، ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا، کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل، اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حیثیت اور مدت سے لے کر ایک محدود عرصہ تک رہتا ہے، اس کے باوجود ہیں اس کو یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر اس کے قیام و بقا، زندگی، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشو و نما اور ارتقا کسی چیز میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، عہد طفلی تک شاید کچھ اور واسطہ ہو، اس کے بعد تو بچہ اپنے والدین سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے، اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے،

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے، جو آغاز سے انجام تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر موجودات کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، وہ ذرہ ہو یا پتھر، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو، یا مشت استخوان، شکم مادر میں ہو، یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو، کوئی آن کوئی لمحہ، رب العلمین کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے استغنا اور بے نیازی نہیں ہو سکتی،

علاوہ ازیں، باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے رب یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندو دین نے

ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے،

اب ہم کو ان آیتوں اور حدیثوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے جن سے روشن ہو، کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق ومحبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الٰہی ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی،

والذین امنوا اشد حباً للّٰہ
(بقرہ ۔)

جو ایمان لائے ہیں، وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں،

اس نشۂ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، تجارت، مال، خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہئے، ارشاد ہوتا ہے۔

اِن کَانَ اٰبَاءُکُمْ وَاَبْنَاءُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ
وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ
اقترفتموھا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا
ومسَاکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ
ورسولہ وجھاد فی سبیلہٖ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰی
یاتی اللّٰہ بامرہٖ (توبہ)

اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے، خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارا ہے، تو اس وقت کا انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لائے،

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی، تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

یا ایھا الذین امنوا من یرتد
منکم عن دینہٖ فسوف یاتی اللّٰہ
بقوم یحبھم ویحبونہ
(مائدہ)

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا، تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے،

حضرت مسیح نے کہا، درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے، مگر نہ تمھارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمھارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن، اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمھارے دعوی کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویٰ دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے، .

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ، (آل عمران)	اگر تم کو خدا سے محبت ہے، تو میری پیروی کرو، کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا،

طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں، جن کو خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے.

ان اللہ یحب المحسنین، (مائدہ)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
ان اللہ یحب التوابین، (بقرہ)	خدا توبہ کرنے والوں پیار کرتا ہے،
ان اللہ یحب المتوکلین، (آل عمران)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے.
ان اللہ یحب المقسطین، (مائدہ)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے.
ان اللہ یحب المتقین، (توبہ)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے،
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ (صف)	خدا ان کو پیار کرتا ہے، جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں
واللہ یحب الصابرین، (آل عمران)	خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
واللہ یحب المطہرین، (توبہ)	اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے،

دنیا کے عیش و مسرت، باغ و بہار، شادی و خوشی میں اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہے، اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی و حال اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم ہے، اور دوسرے کا نام خوف و وحشت ہے،

غرض غم اور خوف ہی وہ کانٹے ہیں، جو انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے دلدادہ شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے، کہ ان کا چمنستان عیش اس خار زار سے پاک ہوگا،

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ خوف ہے، اور نہ غم
ولا ھم یحزنون، (یونس)	ہوں گے،

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اسلام خدا کا تمام تر رحم ہے، اس کے رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان ورحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے، سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو، اسی لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے، گنہ گاروں اور مجرموں کو وہ اپنے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے،

قل یا عبادی الذین اسرفوا علے	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں
انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان	نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، کہ وہ اللہ کی رحمت سے
اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو	مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا
الغفور الرحیم، (زمر)	ہے، کہ وہی بخشش کرنے والا ہے رحم کھانے والا ہی،

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں، تو کہتے ہیں:۔

ولا تکن من القانطین،	ناامیدوں میں سے نہ ہو،

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے، کہ مرتبۂ خلت محبت سے مافوق ہے، جواب دیا،

ومایقنط عن رحمۃ ربہ الا القوم	اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا
الضالون، (حجر)	کوئی اور مایوس نہیں ہوتا،

خدا پر بندوں کی جانب سے کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں، منجملہ ان کے ایک رحمت ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہ گاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ

منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور ہے، رحمان و رحیم ہے، رؤف و عفو ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے، اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام)، اللہ نے خود اپنے اوپر مہربانی کرنے کو لازم کر لیا ہے،

خاص قاصد کو حکم ہوتا ہے، کہ ہمارے گنہ گار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو، کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے،

وَاِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، (انعام)

اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی بڑائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیک بنے تو بیشک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ، (اعراف) اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے،

بخاری و ترمذی وغیرہ صحیح حدیثوں میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا، تو اس نے اپنے دست خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی، ایک دفعہ آپ نے فرمایا، کہ "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عذاب ہے، تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا، کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا" یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہ احدیت کا آخری قاصد خداوند کی جانب سے گنہ گاروں کو بشارت سناتا ہے، کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھ کو پکارتے رہو گے، اور مجھ سے آس لگائے رہو گے، میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی چاہو، تو معاف کر دوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری

سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم ہمارے پاس آؤ، اور میرا کسی کو شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں، کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے،

حضرت ابو ایوب صحابیؓ کی وفات کا وقت جب قریب آیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا، جو گناہ کرتی، کہ وہ اس کو بخشتا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم وکرم کے اظہار کے لئے گنہ گاروں ہی کی تلاش ہے، کہ نکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہ گاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے،

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم وکرم اور مہر ومحبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں، اولادوں میں میل ملاپ اور رسم ومحبت ہے، اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق ومحبت کے یہ مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے، کہ شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کتنا حصہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں[1]، اس لطف وکرم اور مہر ومحبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہ گار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے، کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا "خداوندا تو اپنی لعنت اس پر نازل کر، کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، رحمۃ للعالمین کو صحابہ کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا، اس پر لعنت نہ کرو، کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔

ابن ماجہ میں ہے، کہ مدینہ میں ایک غریب مسلمان نے وفات پائی، اس کا غم کس نے کیا ہوگا، ہاں اس بزرگ انسان نے جو دنیا کا غم خوار بن کر آیا تھا، اس کے فراق ظاہری سے چہرۂ مبارک پر اندوہ ملال کے آثار تھے، صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے، فرمایا ہاں، کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت تھی، اس غریب میں اس محبت کا اثر یہ تھا، کہ وہ ہمیشہ زور زور سے قرآن پڑھا کرتا تھا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "آپ نے ایک صاحب

---

[1] یہ حدیثیں دوسری صحیح کتابوں میں بھی ہیں، مگر میرے پیش نظر اس وقت جامع ترمذی (ابواب الدعوات) ہے،

کو جماعت کا افسر بنا کر بھیجا تھا، وہ جب نماز پڑھاتے تھے، تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے تھے، جب سفر سے یہ جماعت لوٹ کر آئی، تو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اس نے یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا، ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت بیان کیگئی ہے، تو مجھکو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا، ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے،

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے، کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دریافت کیا، کہ "یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی، فرمایا، تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا ہے؟ نادم اور شکستہ دل ہو کر عرض کیا، کہ یارسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا، نہ روزوں کا، اور نہ صدقات وخیرات کا بڑا ذخیرہ ہے، جو کچھ سرمایہ ہے، وہ خدا اور رسولؐ کی محبت ہے، اور بس، فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا، وہ اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی،

صحیح مسلم کی روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے، تو فرشتۂ خاص حضرت جبرئیل سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں، تو جبرئیلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور آسمان میں پکار دیتے ہیں، کہ خدا اس بندہ کو پیار کرتا ہے، تم بھی پیار کرو، تو آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں، اور پھر زمین میں اس کو ہردلعزیزی اور حسن قبول حاصل ہوتا ہے،

ترمذی میں ہے، کہ حضرت ابوہریرہؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں، کہ "میرا بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو اس قدر ڈھونڈتا ہے، کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، یہاں تک کہ میں اس کی وہ آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے،

امام بزاز نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں، جو نہ نبی ہیں، اور نہ شہید ہیں، لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں، جن کو خدا سے محبت ہے، اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے ہیں، اور بری باتوں سے روکتے ہیں، الخ

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، کہ آپ نے فرمایا، لوگو! خدا سے محبت کرو، کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے، اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو،

جو کچھ اسلام کی تعلیم تھی، وہ پیغمبر اسلام کی عملی زندگی تھی،

عام طور پر پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں قلت اور محبت کے کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خلوت و جلوت کی دعاؤں میں اور خلوت کی تنہائیوں میں کیا ڈھونڈتے تھے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے تھے، اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے، لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے،

اسئلک حبک وحب من یحبک و حب عمل یقرب الی حبک، (احمد، ترمذی، حاکم)	خداوندا! میں تیری محبت مانگتا ہوں، اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے، اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے،
اللھم اجعل حبک احب الیّ من نفسی و اھلی و من الماء البارد، (ترمذی، حاکم)	الٰہی! تو اپنی محبت کو جان سے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا،

عرب میں ٹھنڈا پانی، دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے، لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی، وہ صرف محبت الٰہی ہی کا زلال خالص تھا، جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں، مگر ایک عاشق الٰہی (مسیح) کا قول ہے، کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا"، پھر وہ کون روٹی ہے، جس کو کھا کر انسان پھر بھی بھوکا نہیں ہوتا، حضور دعا فرماتے ہیں،

اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبّہٗ عندک، (ترمذی)	خداوندا! تو مجھے اپنی محبت اور اس شخص کی محبت کی محبت تیرے نزدیک میرے لئے نافع ہے، روزی کر،

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے، صحیحین میں ہے،

من کان اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواہ۔ — جو اللہ اور اس کے رسول کو تمام ماسوا سے زیادہ محبوب رکھے۔

بعض مذاہب کو اپنی تعلیم پر ناز ہے، کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں، کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں، اور ان سے اسی طرح محبت کریں، اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے، ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اسلام کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار کو پست تر اور فروتر سمجھتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جا چکی ہے،

واذکروا اللہ کذکرکم اٰباءکم او اشد ذکرا۔ — تم خدا کو اسطرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ۔

احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے، اپنی جان وہاں جا کر بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچے سے، بچہ ماں سے الگ ہے اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، اس میدان حشر میں اس کا بچہ گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کو نظر آجاتا ہے، بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے، رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے، صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے، کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟ لوگوں نے عرض کی، ہرگز نہیں، فرمایا، تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔ (صحیح بخاری باب رحمۃ الولد)

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے، اور عرض کرتی ہے، یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا، ہاں بیشک اس سے زیادہ ہے، بولی، تو کوئی ماں اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارہ نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا اس بندہ کو عذاب دیتا ہے، جو سرکشی سے ایک خدا کو دو کہتا ہے۔ (سنن نسائی باب ما یرجی من الرحمۃ)

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں، اور واقعہ عرض کرتے ہیں، کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا، تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑا کو کھول دیا، تو وہ فوراً آکر اپنے بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، باب رحمۃ اللہ)

ربانی تھا؛ عشق کا آخری ہوش مند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاوداں کا آخری نغمہ خواں عندلیب، نظارۂ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستورِ ازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری لمحوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یکایک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لب مبارک وا ہوتے ہیں، تو یہ آواز آتی ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، میرا پیارا صرف ایک ہی ہے، وہی جس نے ابراہیم کو اپنا پیارا بنایا، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا؛ خداوندا! بہترین رفیق، (صحیح بخاری وفات)

پروفیسر نکلسن ایک دفعہ غور سے ان صفحات کو پڑھیں، یہ سچ ہے کہ اسلام رحمت الٰہی کے ساتھ غضب الٰہی کا بھی معتقد ہے، مگر جانتے ہو کہ اسلام کے عقیدہ میں اس کی رحمت و غضب کا باہمی توازن کیا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِی (بخاری) میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔

(معارف ماہ جولائی ۱۹۲۳ء)

محمد بن عمر الواقدی

(۱)

سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی،

سیرت کے مشہور راویوں میں سے ایک محمد بن عمر واقدی ہے، سنہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا، اور سنہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں پیدائش ہوئی، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، اور قضاء کا منصب حاصل کیا، ابتدائی مصنفینِ سیرت میں اس کا شمار ہے، سیرت میں اس کی ایک کتاب ہے، جس کا نام کتاب المغازی ہے، جس میں عہد نبوت کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے، اگلے مصنفین کا یہ حال تھا، کہ چونکہ وہ ہر واقعہ کو اور واقعہ کے ایک ایک جز کو الگ الگ سلسلہ سے بیان کرتے تھے، اس لئے واقعہ کا تسلسل بیچ بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، جس سے عام لوگوں کی دلچسپی کم ہو جاتی تھی، واقدی نے یہ طرز اختیار کیا کہ پورے واقعہ یا پورے غزوہ کے سارے راویوں کا نام شروع میں گنا دیا، اور ایک دلچسپ مسلسل داستان کی صورت میں پورے واقعہ یا پورے غزوہ کو بیان کر دیا، اس طرح سے عام لوگ جو روایتوں کے پُر پیچ عالمانہ سلسلوں میں پھنس کر اپنا لطف مطالعہ نہیں کھونا چاہتے تھے، انھوں نے اس کی کتاب کو بیحد پسند کیا، اور خلفائے عباسیہ اور دیگر امرائے برامکہ کی نگاہ میں اس نے بڑا رتبہ پیدا کیا، لیکن جس قدر امراء و سلاطین کے یہاں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا، اسی قدر علمائے زمانہ، ائمۂ حدیث، اور معتبر بزرگوں کی مسندِ اعتبار سے اس کو دوری حاصل ہوتی گئی،

اس بات پر مخالف و موافق رائیں اور شہادتیں متفق ہیں، کہ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، اور اسی قوتِ حافظہ

کی بنا پر اس کو خاص امتیاز ہے، چنانچہ اس کے کاتب محمد بن سعد نے طبقات (۵، ۳۱۴) میں لکھا ہے،

وکان عالماً بالمغازی والسیرۃ والفتوح	وہ مغازی، سیرۃ، فتوحات اور حدیث و احکام میں
وباختلاف الناس فی الحدیث	لوگوں کے اختلافات، اور جن امور پر ان کا
والاحکام واجتماعھم علی ما اجتمعوا علیہ	اجماع ہے، ان کا عالم تھا،

مجاہد بن موسیٰ کا قول ہے، کہ "میں نے واقدی سے زیادہ قوتِ حفظ رکھنے والا نہیں دیکھا، حافظ ذہبی میزان میں اس قول کو لکھ کر کہتے ہیں،

قلت وصدق کان الی حفظہ المنتھی	میں کہتا ہوں یہ بات سچ ہے، کہ واقدی کا حافظہ
فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث	تاریخ، سیر، غزوات، وقائع اور لوگوں کے حالات
وایام الناس والفقہ وغیر ذلک،	اور فقہ میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے،

مصعب زبیری کہتے ہیں:۔

واللہ ما رأینا مثل الواقدی قط،	بخدا ہم نے واقدی کا مثل نہیں دیکھا۔

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں کہتے ہیں:۔

ھو ممن طبق الارض شرقھا و	یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی شہرت نے زمین کے
غربھا ذکرہ ولم یخف علی احد	مشرق و مغرب کو گھیر لیا ہے، اور جو شخص کہ تاریخ
عرف اخبار الناس امرہ وسارت	سے واقف ہے، اس سے اس کا حال چھپا نہیں
الرکبان بکتبہ فی فنون العلم من	ہے، مغازی، سیر اور طبقات، اور آنحضرت صلی اللہ
المغازی والسیر والطبقات و	علیہ وسلم کے حالات اور جو واقعات آپ کے زمانہ
اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں ہوئے، اور آپ کی وفات کے بعد ہوئے ان
والاحداث الکائنۃ فی وقتہ	چیزوں میں اس کی کتاب کو لوگ ہر جگہ لئے
وبعد وفاتہ،	پھرتے ہیں،

یہ واقدی کے علم و حفظ کے وہ واقعات ہیں، جن پر سب کا اتفاق ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ واقدی وثوق.

اعتبار، اور سند کے لحاظ سے کس رتبہ کا آدمی ہے، بعض لوگوں نے اس کے موافق بھی شہادت دی ہے، مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقف کاروں کا بڑا حصہ جس میں امام شافعی، امام ابن حنبل، امام بخاری وغیرہ داخل ہیں، اس کو بے اعتبار جھوٹا، اور دروغ گو کہتا ہے، اور اسی لئے اس کی روایتوں کو محدثوں نے حدیث اور احکام کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے، اور نیز علماء کے نزدیک اس کی کتاب المغازی کو وہ حیثیت نہیں حاصل ہوئی، جو محمد بن اسحاق کی سیرت کو حاصل ہوئی، بہرحال واقدی کی کتاب المغازی ایک نادر و کمیاب کتاب تھی، اور ہم علماء مستشرقین کے ممنون ہیں، کہ انھوں نے اس کتاب کو چھاپ کر وقف عام کیا۔

۱۸۵۷ء کے پس و پیش عہد میں جرمن عالم ڈاکٹر اسپرنگر کے بدولت ہندوستان میں عربی کتابوں کی اشاعت کا نادر موقع بہم پہنچا، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس باب میں خاص اہمیت حاصل کی، صحابہ کے حالات میں حافظ ابن حجر کی تصنیف الاصابہ فی تمیز الصحابہ کی اشاعت سے ڈاکٹر اسپرنگر اور ایشیاٹک سوسائٹی کو خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر پہلے یورپین عالم ہیں، جنھوں نے عربی ماخذوں سے "دی لائف آف محمد" ترتیب دی، اور اس لئے اس نے یورپ کے علمی حلقوں میں ایک جگہ پیدا کر لی۔

اے۔ وان۔ کریمر (A. Vankremer) جو مشہور یورپین مستشرق ہیں، اور سرکاری تعلق یعنی آسٹریا کے وکیل مطلق کنسولیٹ جنرل کی حیثیت سے اسکندریہ (مصر) میں مقیم تھے، انھوں نے واقدی کی کتاب المغازی کا واحد نایاب نسخہ دمشق کے ایک کتب خانہ میں پایا، جون ۱۸۵۴ء میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اسکندریہ میں الفرڈ وان کریمر صاحب سے ملاقات کی، اور ان کی کتاب المغازی واقدی کا نسخہ دیکھا، اور ان کو آمادہ کیا، کہ بلوتھیکا انڈیکا کے سلسلے میں وہ اس کو مرتب (ادٹٹ) کریں، اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپوائیں، فروری ۱۸۵۶ء میں جب وہ ہندوستان آئے، تو یہ کتاب چھپ چکی تھی یعنی ۱۸۵۵ء میں چھپ چکی تھی، بہرحال ابن ہشام کے بعد سیرت نبوی میں یہ دوسرا ابتدائی ماخذ تھا، جو یورپ کے ہاتھ آیا، اس لئے اس کے ساتھ خاص اہتمام برتا گیا، دلہاؤسن نے ۱۸۸۲ء میں "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے جرمنی میں اس کا ترجمہ شائع کیا، جو بڑی حد تک یورپ کے مستشرقوں کا مسند اور ماخذ قرار پایا، چنانچہ ۱۹۰۵ء میں پروفیسر مارگیولیتھ نے انگریزی میں "محمد اور ترقی اسلام" کے نام سے سیرۃ میں جو فاضلانہ کتاب تصنیف کی ہے، اور جس میں پہلی دفعہ ایک مستشرق نے سیرۃ میں احادیث کو ماخذ

قرار دیا ہے، اس لئے وہ خاص اعتبار کی مستحق ہے۔ اس میں بھی وہ دلہاؤسن سے مستغنی نہ ہو سکے۔ اور کتاب المغازی کے اصل عربی نسخہ کے بجائے دلہاؤسن ہی کے ترجمہ کو انھوں نے قابل قبول سمجھا۔

اتنی تمہید کے بعد اب اصل مقصد سنئیے! ابھی حال میں مانچسٹر گارجین اخبار (انگلستان) میں ایک مضمون نکلا ہے جس میں مضمون نگار نے ایسے فقرے لکھے ہیں، جن سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے، منجملہ ان کے ایک فقرہ یہ ہے کہ "آپ ایسے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ بدر میں جب خون بہتے دیکھا، تو آپ کو غش آگیا"۔ ایک مسلمان نے مضمون نگار سے اس واقعہ کا حوالہ دریافت کیا۔ تو اس نے مارگیولیوتھ کی کتاب کا حوالہ دیا، مارگیولیوتھ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب (محمد اینڈ دی رائیز آف اسلام ص ۲۵۹) میں بے حوالہ نقل کیا ہے۔ اس لئے مارگیولیوتھ صاحب سے اس کا ماخذ دریافت کیا گیا۔ تو انھوں نے واقدی کے جرمن ترجمہ دلہاؤسن کا حوالہ دیا، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے پچھلی ڈاک سے یہ پوری خط و کتابت میرے پاس بھیج دی ہے، اس کو پڑھ کر یورپین مستشرقین کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی ایک اور عمدہ مثال ہاتھ آگئی۔

پروفیسر مارگیولیوتھ اپنے کرمنامہ میں لکھتے ہیں،

مورخہ ۴ر نومبر ۱۹۲۵ء، آکسفورڈ۔

"جناب من! میرا خیال ہے کہ مضمون نگار نے "محمد اور ترقی اسلام" کے حسب ذیل فقرہ کا حوالہ دیا ہے (ص ۲۵۹) جب خون کا پہلا قطرہ بہایا گیا، تو پیغمبر اپنے جھونپڑے میں واپس آئے، اور نڈھال ہو کر غش کھا گئے۔ Fainted یہ بعینہ واقدی کے الفاظ ہیں۔ برٹش میوزیم ۱۹۱۷ء جس کا ترجمہ دلہاؤسن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے برلن میں ۱۸۸۲ء میں کیا ہے، (ص ۴۵) کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد نڈھال ہو کر غش کھا گئے!" (Hai n Tea) واقدی آگے کہتا ہے: "محمد بہر حال بہت جلد ہوش میں آگئے"۔ روایت کی دوسری شکل میں ہے، کہ (ص ۵۸) کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو محمد نے دعا کی۔ ابوبکر نے تسلی دی"۔ صحیح مسلم مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ء جلد ۲، ص ۵۵ اور واقدی ص ۵۵ سے یہ ظاہر ہے، کہ یہ دعا اس بیہوشی کے دورہ سے افاقہ کے بعد مانگی گئی تھی، میں نے واقدی کے اس فقرے کو کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ "جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا" خود واقدی کا مطلب ادا کر دیا ہے"۔

خواجہ صاحب نے جب پروفیسر مارگیولیوتھ کو لکھا کہ واقدی کا حوالہ بے کار ہے، کہ وہ مسلمانوں میں معتبر نہیں، تو موصوف نے یاقوت حموی کی کتاب معجم الادبا کی جلد ۷ کا جو ہنوز ان کی اڈیٹرشپ میں زیر طبع ہے، اس کا حوالہ دیا، کہ یاقوت نے لوگوں سے اس کی توثیق نقل کی ہے، خط کی عبارت یہ ہے :-

مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۵ء،

جناب من!

میں فرصت کے وقت اس نقطہ پر غور کروں گا، جدھر آپ نے مجھ کو متوجہ کیا ہے، اور یہ مجھ کو اس صدمہ سے بھی نجات دلانے کے لئے تھوڑا سا وقت لے گا، کہ آپ واقدی ایک مسلمان مورخ کو جو بہت سے مستند اصحاب کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے، ایک مشہور دروغ گو کہتے ہیں، وہ ائمۂ اسلام جو واقدی کو اس نظر سے دیکھتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ ہر حیثیت سے بالکل معتبر ہے، یاقوت نے معجم الادبا کی ساتویں جلد میں جو ابھی زیر طبع ہے، ان کو گنایا ہے،

سب سے پہلے ہم کو پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے، کہ انھوں نے واقدی کی توثیق اور معتبر ہونے کے لئے یاقوت کا حوالہ دیا ہے، دنیا جانتی ہے، کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب و جغرافیہ و تاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح و تعدیل سے کیا تعلق ہے؟ ہمارے پروفیسر صاحب کو واقدی کے معتبر شمار کرانے میں خاص انہماک ہے، ۱۵ء یا ۱۶ء میں جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے بلاوے پر ہندوستان آئے تھے، تو لکھنؤ میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس ملاقات میں بھی دانستہ یا نادانستہ واقدی ہی کی معتبری و نامعتبری کی بحث چھڑ گئی تھی، میں نے کہا تھا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "امام شافعی کی نسبت کیا کہتے ہو، کہ وہ اس سے روایت کرتے ہیں" میں نے کہا اگر یہ درست ہے تو نفس روایت کرنا یہ معنی نہیں رکھتا، کہ امام نے اس کی توثیق کی ہے، درانحالیکہ کتب نقد میں بہ صاف تصریح ہے، کہ امام موصوف ان کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے،

بہرحال اب معجم الادبا کی ایڈیٹری کی تقریب سے پروفیسر صاحب کو واقدی کے مداحوں کے چند نام اور ہاتھ آئے ہیں، لیکن میں بتانا چاہتا ہوں، کہ واقدی کی توثیق کے لئے ایک ادیب وجغرافی واخباری کی تصنیف کے حوالہ کی ضرورت نہیں، واقدی کی حمایت میں جو اقوال اس کے اندر ہوں گے، وہ ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں، آٹھویں صدی میں یاقوت نے جو کچھ جمع کیا ہے، وہ سب آٹھ صدیوں کی جرح و تعدیل کی کتابوں میں مذکور ہے، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی کا حامی اور مدافع علامہ ابن سید الناس اندلسی المتوفی سنہ ۷۳۴ھ سے زیادہ کوئی نہیں، انھوں نے ان دونوں کے متعلق جس قدر توثیق اور استناد کے اقوال ملے، سب کو اپنی کتاب "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" کے مقدمہ میں یکجا کر دیا ہے، اسی کے ساتھ امام ذہبی نے میزان الاعتدال نے اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے مخالف وموافق جو کچھ کہا گیا ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس سے کچھ زیادہ یاقوت کی متوقع جلد میں نہ ہوگا۔

نفس واقعہ غشی کی تحقیق کے لئے بحث کی تین منزلیں ہیں، واقدی کی حیثیت، اس کی کتاب المغازی کی حیثیت، اور اصل واقعہ کی صورت۔

واقدی کی حیثیت | واقدی کے حافظ اور کثرت معلومات کی شہادتیں اوپر گذر چکی ہیں، امام شاذکونی نے اس کے متعلق ایک نہایت ظریفانہ فقرہ کہا ہے، کہ واقدی بہرحال بہت بڑا آدمی تھا، اگر وہ جھوٹا تھا، تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، اور اگر سچا تھا، تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، واقدی کی ذات آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے معرض بحث میں رہی ہے، اور اس کا سلسلہ خود اس کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا بدقسمت راوی شاید ہی ملے گا، جس کی ایک آدھ نے توثیق نہ کر دی ہو، اس لئے علمائے اصول کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مخالف یا موافق دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور ان کو باہم تول کر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں، واقدی کا بھی یہی حال ہے، چنانچہ اس کے متعلق مخالف وموافق دونوں پہلو حسب ذیل ہیں۔

اس کے موافق پہلو کا روشن حصہ یہ ہے کہ اس کے علم وحافظہ کی سب نے تعریف کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے، کہ ایک دفعہ امام مالک سے قتل ساحرہ کی نسبت دریافت کیا گیا، تو امام نے فرمایا کہ دیکھو واقدی کے پاس اس کے متعلق کچھ ہے؟ لوگوں نے اس سے پوچھ کر امام مالک کو اطلاع دی، تو لوگ کہتے ہیں، کہ امام نے اس پر قناعت کی،

اسی طرح ایک دفعہ اور امام سے کسی نے دریافت کیا، کہ خیبر کی اس یہودی عورت سے جس نے آپکے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپ نے کیا برتاؤ کیا، امام نے فرمایا، کہ مجھ کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اہل علم سے دریافت کر دوں گا، چنانچہ امام نے واقدی سے ملاقات کی، تو دریافت کیا، اور حلقہ میں آکر فرمایا، کہ اہل علم نے یہ جواب دیا، دراوردی ایک ناقدِ حدیث ہیں، ان سے کسی نے پوچھا، کہ واقدی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا تم واقدی کو مجھ سے پوچھتے ہو، تم واقدی سے مجھ کو پوچھو، یہی جواب ابو عامر عقدی اور معن بن عیسٰی نے بھی دیا ہے،

ان اقوال کے علاوہ میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور عیون الاثر میں جن علماء نے جن الفاظ میں اس کی توثیق کی ہے، وہ حسب ذیل ہیں،

نام	اصل قول	ترجمہ
دراوردی	الواقدی امیر المومنین فی الحدیث	واقدی حدیث میں مسلمانوں کا امیر ہے
یعقوب بن شیبہ	حدثنی بعض اصحابنا انہ ثقۃ،	ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ وہ ثقہ ہے.
مصعب زبیری	ھو ثقۃ مامون	وہ ثقہ اور مامون ہے،
ابن نمیر	اما حدیثہ ھنا فھو مستو	اس کی حدیث یہاں تو برابر ہے لیکن اہل
	اما حدیث اھل المدینۃ	مدینہ کی حدیث تو وہ اس سے زیادہ واقف
	فھم اعلم بہ،	ہیں، (یعنی اس کے متعلق وہ فیصلہ کریں)
ابراہیم الحربی	الواقدی امین الناس فی الاسلام	واقدی اسلام میں لوگوں کا امین ہے،
محمد بن اسحاق الصنانی	لولا انہ عندی ثقۃ	اگر وہ میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتا تو میں
	ماحدثت بہ،	اس سے روایت نہ کرتا،
یزید بن ہارون	الواقدی ثقۃ،	واقدی ثقہ ہے،
عباس عنبری	ھو احب الی من عبد الرزاق	وہ مجھے عبد الرزاق سے زیادہ پسند ہے،
ابو عبید القسم بن سلام	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،
مسیبی	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،

(۱) تفصیل کے لئے دیکھو کتب مذکورہ حالات محمد بن عمر الواقدی

یہ واقدی کے طرفداروں کی سب سے بڑی فہرست ہے، مگر یہ دیکھو کہ کیا ان میں کوئی بھی مشہور امام ہے؟ فنِ نقد کے اساطینِ اعلام میں سے کسی کا نام ہے؟ بے شبہ یہ لوگ بھی قابلِ وقعت ہیں، اور ان سے بڑی مخالف شہادتیں اگر موجود نہ ہوتیں، تو ان کی موافق شہادتیں بڑا درجہ رکھتیں، مگر حالت یہ ہے کہ خود ان طرفداروں میں سے بھی جو لوگ اس کی حالت سے واقف ہو گئے، انھوں نے اس کو چھوڑ دیا چنانچہ ابن نمیر جنھوں نے یہ کہا ہے کہ "اس کی حدیث بیان ٹھیک ہے" انھوں نے بھی اس کو چھوڑ دیا۔ (تہذیب)۔ ابن سعد جو واقدی کا کاتب تھا، اور جس سے اس کی حمایت کی امید ہو سکتی ہے، دو صفحوں میں اس نے اس کا حال لکھا ہے، مگر ایک حرف بھی اس کی توثیق اور اعتبار و استناد کے متعلق نہیں لکھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "اس کی کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں" سب سے بڑے ناقدِ فن اور امامِ حدیث امام بخاری اپنی تاریخ صغیر میں جو اس وقت اسماء الرجال کی سب سے پرانی دستاویز ہمارے پاس ہے، واقدی کے متعلق محدثین کا یہ طرزِ عمل ظاہر کرتے ہیں (مطبوعہ الہ آباد، ص ۲۲۸)

محمد بن عمر الواقدی ابو عبد اللہ الاسلمی	محمد بن عمر الواقدی ابو عبد اللہ اسلمی مدینہ کے ہیں، بغداد
مدنی قاضی بغداد ترکوہ	کے قاضی تھے، محدثین نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔

امام ممدوح کتاب الضعفاء الصغیر میں فرماتے ہیں۔ (مطبوعہ الہ آباد، ص ۳۲)

متروک الحدیث	وہ متروک الحدیث ہے۔

امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ جن کی تصنیف حدیث کی چھ معتبر کتابوں میں سے ایک ہے، اپنی تصنیف کتاب الضعفاء والمتروکین میں کہتے ہیں۔

متروک الحدیث	وہ متروک الحدیث ہے،
امام موصوف اسی کتاب میں لکھتے ہیں:۔	(ص ۵۳)
والکذابون المعروفون بوضع الحدیث	اور وہ جھوٹے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر حدیث
علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اربعۃ	گھڑ کر بیان کرنے میں مشہور ہیں۔ چار شخص ہیں۔
ابن ابی یحییٰ بالمدینۃ والواقدی ببغداد	ابن ابی یحییٰ مدینہ میں، واقدی بغداد میں، مقاتل
ومقاتل بن سلیمان بخراسان ومحمد بن	ابن سلیمان خراسان میں، اور محمد بن سعید

سعید بالشام،

شام ہیں،

ان متفق علیہ اماموں کے فتوے کے بعد واقدی کے طرفداروں کی حیثیت جس قدر رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، اب آگے چلئے، رجال کی عام کتابوں تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی وغیرہ کا جائزہ لیجئے، امام بخاری کے استاد ابن مدینی کہتے ہیں،

عندہٗ عشرون الف حدیث یعنی مالہا اصل وقال فی موضع آخر لیس ھو بموضع للروایۃ وابراھیم بن یحیی کذاب وھو عندی احسن حالاً من الواقدی،

(تہذیب، ج ۹، ص ۳۶۶، ۳۶۷)

واقدی کے پاس بیس ہزار حدیثیں ہیں یعنی انکی کوئی اصل نہیں ہے، دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ واقدی روایت کے کسی مرتبہ میں نہیں ہے، ابراہیم بن یحیی بڑا جھوٹا ہے، مگر واقدی میرے نزدیک اچھا ہے،

ایک اور ان کا قول ہے،

الھیثم ابن عدی اوثق عندی من الواقدی ولا ارضاہ فی الحدیث ولا فی الانساب ولا فی شیٔ۔

(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۴، ۳۶۵)

(میزان الاعتدال ج ۳، ص ۱۱۰)

ہثیم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے، میں واقدی کو حدیث میں اور نہ نسبوں کے بیان میں اور نہ کسی اور چیز میں پسند کرتا ہوں،

الواقدی یضع الحدیث،

(میزان، جلد ۳، ص ۱۱۰)

واقدی جعلی حدیث بنایا کرتا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں،

کان بالمدینۃ سبع رجال یضعون الاسلام احدھم الواقدی،

(تہذیب جلد ۹، ص ۳۶۷)

مدینہ میں سات آدمی تھے، جو اسناد جعلی بنایا کرتے تھے، ان میں ایک واقدی ہے،

اہل سنت کے امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں،

الواقدی کذاب، — واقدی بڑا جھوٹا ہے،

(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۴)

لم یزل یدافع امر الواقدی حتی روی عن معمر عن الزہری وعن نبہان عن ام سلمۃ افعیما و ان انتما فجاء بشئ لاحیلۃ فیہ، (تہذیب، ج ۹ ص ۳۶۳، ۳۶۴)

واقدی کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کی جاتی رہی یہاں تک کہ اس نے معمر، زہری، نبہان اور ام سلمہ کے مسلسل واسطے سے روایت کی تو اب اس کی مدافعت کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا،

ھوکذاب یقلب الاحادیث، — وہ بڑا جھوٹا ہے، حدیثیں الٹ پلٹ ڈالتا ہے،

(میزان، جلد ۳، ص ۱۱۰)

دیکھو فن کے اماموں نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے،

قال البخاری الواقدی متروک الحدیث ترکہ احمد وابن المبارک وابن نمیر واسماعیل بن زکریا، (تہذیب، ج ۹ ص ۳۶۴)

بخاری نے کہا واقدی متروک الحدیث ہے امام احمد، عبد اللہ ابن مبارک، ابن نمیر اور اسمٰعیل ابن زکریا نے اس کو چھوڑ دیا،

علی بن مدینی بغداد آئے، تو وہاں کے شیوخ کے حلقوں میں پھرے، واقدی کے حلقہ میں چلنے کی ان کے رفیق نے سفارش کی تو ان کو متردد پایا، بالآخر بغداد کے امام احمد بن حنبل کو لکھ کر استصواب کیا، امام نے یہ جواب دیا،

کیف تستحل ان تکتب حدیث رجل روی عن معمر حدیث نبہان، (تہذیب ج ۹ ص ۳۶۴)

تم اس شخص سے حدیث لکھنا کیسے جائز سمجھتے ہو جس نے معمر سے نبہان والی حدیث روایت کی،

فن نقد کے امام یحیٰی بن معین فرماتے ہیں،

ضعیف لیس بشئ کان یقلب حدیث یونس بغیرہ عن معمر لیس بثقۃ

ضعیف ہے، وہ کچھ نہیں، وہ یونس والی حدیث دوسرے کے نام بدل دیتا تھا، وہ ثقہ نہیں ہے،

(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۴)

لیس بثقة لایکتب حدیثه ،	وہ ثقہ نہیں، اس کی حدیث نہ لکھی جائے،

(میزان، جلد ۳، ص ۱۱۰)

صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک ابوداؤد کہتے ہیں،

لا اکتب حدیثه ولا احدث عنه	میں اس کی حدیث نہیں لکھتا، اور نہ اس سے
ما اشك انه كان يفتعل الحديث ،	روایت کرتا، مجھے کوئی شک نہیں ہے، کہ وہ
(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۷)	حدیث جعلی بنایا کرتا تھا،

امام ترمذی کے شیخ بندار کہتے ہیں،

ما رأیت اکذب منه، (تہذیب ج ۹ ص ۳۶۷)	میں نے اس سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا،

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں،

هو عندی ممن یضع الحدیث ،	میرے نزدیک وہ ان لوگوں میں ہے، جو حدیث
(تہذیب، ج ۹، ص ۳۶۷)	وضع کیا کرتے تھے،

ابوزرعہ رازی، ابوبشر دولابی اور عقیلی کہتے ہیں،

متروک الحدیث، (تہذیب ج ۹ ص ۳۶۷)	اس کی حدیث چھوڑ دی گئی ہے،

ناقد حدیث ابو حاتم رازی کہتے ہیں، کہ انھوں نے اور محدثین نے کیونکر اس کا امتحان لیا،

وجدنا حدیثه عن المدنیین	ہم نے مدینہ والوں سے اس کی حدیث نامعلوم
عن شیوخ مجهولین مناکیر قلنا	شیوخ سے روایت کی ہوئی منکر پائی، ہم نے کہا
یحتمل ان تکون تلك الاحادیث	کہ ممکن ہے کہ یہ اس کی کارروائی ہے، یا اس کے
منه ویحتمل ان تکون منهم ثم	ان نامعلوم استادوں کی ہو، پھر ہم نے غور سے
نظرنا الی حدیثه من ابی ذئب	اس کی حدیث کو جو ابن ابی ذئب اور معمر سے تھی،
ومعمر فانه یضبط حدیثهم فوجدنا	دیکھا کیونکہ وہ ان لوگوں کی حدیثوں میں ضبط رکھتا
قد حدث عنهما بالمناکیر فعلمنا انه	تھا، تو پایا کہ اس نے ان دونوں بزرگوں سے

منه فتركنا حديثه، | بھی منکر روایتیں کی ہیں، تو ہم نے جان لیا کہ اسی کی
(تہذیب جلد ۹، ص ۳۶۷) | کارروائی ہے، تو پھر ہم نے اس کی حدیث چھوڑ دی۔

ابو حاتم اور نسائی کا بیان ہے،

یضع الحدیث، | وہ حدیث وضع کرتا تھا۔

دارقطنی :-

فیه ضعف، (میزان جلد ۳، ص ۱۱۰) | اس میں کمزوری ہے۔

جوزجانی :-

لم یکن مقنعا، (تہذیب ج ۹، ص ۳۶۸) | وہ تسلی دینے والا نہیں۔

ابن عدی :-

احادیثه غیر محفوظة والبلاء منه، | اس کی حدیثیں غیر محفوظ ہیں، اور آفت اسی
(عیون الاثر، جلد ا، ص ۲۰) | سے ہے،

واقدی کے متعلق اس کے معاصرین اور اس کے قریب العہد ناقدین کی جن میں اسلام کے نامورترین علماء اور ائمہ داخل ہیں، یہ رائیں ہیں، غور کرو، کہ ایسا شخص سیرت کے اہم مباحث میں کوئی قابلِ وقعت سند بن سکتا ہے؟ متاخرین نے اس کی نسبت جو آخری اور اختتامی فیصلہ کیا ہے، وہ بھی سن لیجئے،

امام نووی (صحیح مسلم کے شارح) شرح مہذب کتاب الغسل میں لکھتے ہیں :-

الواقدی ضعیف باتفاقهم | واقدی بالاتفاق ضعیف ہے،

(تہذیب ج ۹، ص ۳۶۸-۳۶۶)

امام ذہبی میزان میں کہتے ہیں :-

استقر الاجماع علی وهن الواقدی۔ | واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع ہو چکا ہے،

(میزان ج ۳، ص ۱۱۱)

علامہ زرقانی مالکی سیرت کی سب سے مبسوط کتاب شرح مواہب میں غزوۂ بدر کے بیان میں واقدی

کی نسبت لکھتے ہیں:۔

الحافظ المتروک مع سعۃ علمہ	حافظ اور باوجود اپنی وسعت علم کے متروک ہے

(شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ، جلد ۱، ص ۸۰۴)

غرض وہ بالاتفاق متروک ہے یعنی چھوڑ دیا گیا ہے، اور اس کی روایت سے پرہیز کیا جاتا ہے، اس لئے وہ استناد کے قابل نہیں، ابن سید الناس نے عیون الاثر میں محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر الواقدی دونوں کی توثیق و جرح کے اقوال یکجا کئے ہیں، اور جرح کے جوابات دینا چاہتے ہیں، چنانچہ محمد بن اسحاق کی جرح کے جوابات بہت جوش و خروش سے دیئے ہیں، مگر محمد بن عمر الواقدی کی جرح کے جوابات نہ دے سکے، اور شروع ہی میں سپر ڈال دیا کہ

اما الکلام فیہ فکثیر "	اس پر اعتراضات بہت زیادہ ہیں،

(عیون الاثر، جلد ۱، ص ۲۰)

واقدی کی کتاب کی حیثیت | خود مصنف کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد، اس کی تصنیف کی حیثیت بھی متعین ہو جاتی ہے، ایسے غیر معتبر، دروغ گو، اور جھوٹے کی روایتوں کے مجموعہ کو کیا درجۂ استناد ہو سکتا ہے، اسی لئے امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

کتب الواقدی کلھا کذب،	واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ ہیں۔

(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۶)

امام دارقطنی فرماتے ہیں:۔

الضعف تبین علیٰ حدیثہ،	اس کی روایت پر ضعف نمایاں ہے،

(تہذیب، جلد ۹، ص ۳۶۸)

واقدی کا طرز تصنیف بتا چکا ہوں، کہ وہ راویوں کے متعدد ناموں کو یکجا کر کے پورا واقعہ بلکہ پوری کتاب قصہ کی طرح بیان کر دیتا ہے، جس سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا، کہ یہ خاص خاص روایتیں اس نے کہاں سے لی ہیں، اسی لئے اس کی کتابیں غیر معتبر بھی جاتی ہیں، اب اسی کتاب المغازی کو لیجئے جو وان کریمر کے جمع و تحشیہ سے کلکتہ میں چھپی تھی، کہ اس کے شروع میں ایک ہی جگہ اپنے پچیس شیوخ کے نام لکھ دیئے ہیں، اور کہہ دیا کہ "ان میں سے بعض کی باتیں بعض سے

مل گئی ہیں، (ص ۱ و ۲ ج ۱) اور اس کے بعد بے سند مسلسل ایک کہانی کی طرح غزوات کے تمام حالات بیان کر دیئے ہیں، کہیں کہیں سند الگ بھی آ جاتی ہے، مگر منقطع بہر حال یہ ابتدائی سندیں بھی صرف اسنادِ شیوخ کی ہیں، ان کے آگے کے راویوں کا اس نے کوئی پتہ نہیں دیا ہے، اس لئے ایسی روایتوں کے مجموعہ کی محدثین کے نزدیک کیا وقعت ہو سکتی ہے، اسی لئے واقدی کی کتاب المغازی ارباب نقد میں کوئی درجہ نہیں رکھتی، چنانچہ امام احمد بن حنبل نے واقدی کی اس طرز تالیف کی بنا پر اس کی کتاب کو غیر مسلّم قرار دیا ہے (جلد ۱، ص ۲۰) ابراہیم حربی واقدی کے ایک طرفدار نے یہ کہا ہے کہ "اگر یہ واقدی کا عیب ہے، تو زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے"[1] مگر یہ جواب اس لئے صحیح نہیں، کہ زہری اور ابن اسحاق کی شخصیت بجائے خود بلند ہے، اس کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں یہ طرز اختیار کیا ہے، پوری کتاب کی یہ حالت انھوں نے نہیں بنا دی ہے، اور واقدی نے اپنی ذاتی کمزوری اور بے اعتباری کے ساتھ ساتھ گویا اپنا یہ وتیرہ اختیار کر لیا، اس سے اس کی کتاب پایۂ اعتبار سے گر گئی، اور سند کے قابل نہیں رہی، پوری کتاب میں شاذ و نادر ہی اس کے یہاں پوری سند موجود ہے، اگر کہیں کہیں ہے بھی تو کسی ابتدائی عینی شاہد تک تو وہ پہنچتی ہی نہیں اور جہاں پہونچتی بھی ہے، تو اس کے رواۃ ناقابلِ اعتبار ہیں، اس لئے اس کتاب کے ایسے واقعات جو دوسری معتبر کتابوں میں موجود نہ ہوں ناقابلِ تسلیم ہیں،

واقعہ کی اصلیت اب اتنی تمہیدوں کے بعد بدر میں آپ کے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کی روایت پر غور کیجئے، اگر یہ واقعہ بالفرض واقدی کی کتاب المغازی میں ہو بھی تو اس کی حیثیت کا اندازہ آپ مصنف اور تصنیف کی حیثیت سے لگا چکے ہوں گے، اور آپ نے سمجھ لیا ہوگا، کہ ایسے جھوٹے بے اعتبار جعلی حدیث بنانے والے کی روایت کا کیا درجہ ہوگا، یہ واقعہ واقدی کی جس روایت پر مبنی ہے، واقدی نے اس کا سلسلۂ سند مطلق نہیں بیان کیا ہے، جس سے معلوم ہو، کہ اس سے کس نے بیان کیا، اور اس نے کس سے سنا، اور اس کا آخری شریک واقعہ عینی گواہ کون ہے، غرض مطلق بے سند بات ہے، اور سیرت اور حدیث کی کسی کتاب سے اس کی تصدیق و تائید نہیں ہوتی،

بہر حال اس خاص واقعہ کی تحقیق کے سلسلہ میں جب مارگیولیتھ صاحب کی کتاب "محمد اور ترقی اسلام" (محمد اینڈ دی رائز آف اسلام)، اور ولہاؤسن کی "محمد مدینہ میں" کا اقتباس مذکور دیکھا، اور اس کا وان کریمر کے شائع کردہ

---

[1] عیون الاثر، ج ۱، ص ۲۰،

اصل عربی متن سے مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ اس دروغ بافی میں بےچارہ واقدی کا اتنا قصور نہیں جس قدر خود دلہاؤسن صاحب اور مارگیولیوتھ صاحب کا ہے "اوّل ظلم درجہاں اندک بود، ہر کہ آمد براں مزید کرد"

سب سے پہلے آپ مارگیولیوتھ صاحب کی روایت پڑھئے،

"جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا، تو پیغمبر اپنی جھونپڑی میں واپس آیا، اورغش کھا گیا، جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنا وقت دعا کے نذر کیا، تاکہ وہ یہ دکھائے کہ وہ بالکل ہوشیار تھا" (ص ۲۵۹)

مارگیولیوتھ صاحب اپنے اس اختراعِ فائقہ کا ماخذ واقدی کے جرمن ترجمہ کو بتاتے ہیں جس کا مترجم دلہاؤسن ہے، اور جس نے اس کا نام "محمد مدینہ میں" رکھا ہے،

"جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد کو غش آگیا...... بہرحال وہ بہت جلد ہوش میں آگئے" (برلن ۱۸۸۲ء، ص ۵۴)

اب آیئے اور واقدی کی کتاب المغازی کھولیں، اس میں کیا ہے، اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

"پھر عتبہ نے اپنے مقابلہ کے لئے (مسلمانوں کو) پکارا، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عریشہ میں تھے، اور آپ کے صحابہ اپنی صفوں میں تھے، تو آپ لیٹ گئے، تو آپ کو نیند نے چھالیا، جو آپ پر غالب آگئی تھی، اور فرمایا، تم اس وقت تک نہ لڑو، جب تک میں تم کو اجازت نہ دوں، اور اگر وہ تمھارے قریب آجائیں، تو ان کو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو، جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یارسول اللہؐ لوگ قریب آگئے، اور انھوں نے ہم کو پالیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے، اور خدا نے آپ کو کافروں کو خواب میں تھوڑا کرکے دکھایا، اور بعض کو بعض کی آنکھوں میں تھوڑا کرکے دکھایا، تو رسول اللہ بےقرار ہوئے، اور دونوں ہاتھ اپنے اٹھائے تھے، اپنے رب سے موعودہ نصرت مانگ رہے تھے"

(کتاب المغازی واقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء، وان کریمر)

ناظرین غور کریں کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے، دلہاؤسن اس کا ترجمہ غشی کرتے ہیں، اور مارگیولیوتھ صاحب اس سے ڈر سے غش کھا کر گرجانا (Hainted) مطلب

نکالتے ہیں، کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہوسکتی ہے، عربی جاننے والوں کے لئے ہم واقدی کی کتاب کی اصل عبارت نقل کردیتے ہیں،

"ثم دعا عتبۃ الی المبارزۃ و رسول اللہ صلعم فی العریش و اصحابہ علی صفوفھم فاضطجع فغشیہ نوم غلبہ و قال لاتقاتلوا حتیٰ اوذنکم و ان اکثبوکم فارموھم ولا تسلوا السیوف حتی یغشوکم، قال ابوبکر یا رسول اللہ اقد دنا القوم وقد نالوا منا فاستیقظ رسول اللہ و قد اراھم اللہ ایاھم فی منامہ قلیلاً وقلل بعضھم فی اعین بعض ففزع رسول اللہ صلعم و ھو رافع یدیہ یناشد ربہ ما دعا لا من النصر"

ہمارے عربی خواں طلبہ غور سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ پڑھ جائیں، اور بتائیں، کہ اس میں کون لفظ ہے جس کا ترجمہ آکسفورڈ اور جرمنی کے پروفیسروں نے "ڈر کر غش کھا کر گر جانا" کیا ہے، نہ تو اس میں "خون کے پہلے قطرہ کے گرنے" کا لفظ ہے، نہ اس میں اس "موقع پر" "باہر سے اندر عریشہ میں آنے" کا لفظ ہے، نہ فوجوں کے باہم مقابل آنے کا لفظ ہے، نہ غش کھانے کا لفظ ہے، نہ پھر "ہوش میں آنے" کا لفظ ہے، کیا مستشرقانہ ژرف نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر دلیل چاہیئے، کیا یہ علمائے یورپ کے ناظر فدارانہ مطالعۂ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں، اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل وکمال اور بے تعصبی کی عمدہ نمایش نہیں،

اب میں بتاتا ہوں، کہ ان فضلائے روزگار کی غلطی کا کیا منشا ہے، واقدی نے اس موقع پر غشیہ نوم غلبہ (نیند آپ پر چھا گئی جو آپ پر غالب آگئی تھی) غشی کا لفظ اس میں ہے، جس کے معنی عربی میں چھا جانے کے ہیں، جیسے قرآن مجید میں ہے،

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ . قسم ہے، رات کی جب وہ چھا جائے،

آکسفورڈ اور جرمنی کے فاضلوں نے غشی کو غشی اور بیہوشی سمجھا، حالانکہ عربی کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جب غشی اور بے ہوشی کے معنی اس لفظ سے ادا کرنا چاہیں گے تو باب افعال کا صیغہ مجہول استعمال کیا جائے گا یعنی "اغشی" پھر جب اس میں مجرد ثلاثی کے فعل معروف کے ساتھ "غشیہ" موجود ہے، اس کے بعد اس کا فاعل لفظ نوم (نیند) موجود ہے، اس کے بعد "استیقظ" نیند سے بیدار ہونا موجود ہے پھر خواب کا دیکھنا مذکور ہے، تو پھر اس موقع

پرسو جانے کے بجائے غش کھانا ترجمہ کرنا کس درجہ نادانی، اور جہالت ہے، اسی کے ساتھ سونے کے وقت جنگ کا نقشہ اور تدبیر بھی آپ بنا رہے ہیں، کیا کوئی ایسی اختیاری غشی بھی ممکن ہے جس کو تھوڑی دیر روک کر کوئی جنگ کی اہم بحث کا فیصلہ بھی کرنا جائے،

نیند کے چھانے کا محاورہ قرآن میں اسی موقع پر آیا ہے،

اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِنْہُ (انفال)	یاد کرو جب خدا اپنے امن سے تم پر نیند کو چھا رہا تھا۔

کیا یہاں بھی ترجمہ "بیہوش کر رہا تھا" مناسب ہوگا،

اب رہی واقدی کی اصل روایت یعنی اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے اور بیدار ہونے، اور خواب میں فوج کو کم تعداد میں دیکھنے کی روایت، تو یہ سرتاپا لغو ہے، اس موقع پر کے تمام واقعات احادیث اور معتبر کتب مغازی میں مذکور ہیں، لیکن ان میں نیند، بیداری اور خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ اس وقت بیداری اور عام مصروفیت کا بیان بتصریح ہے، یہ مشہور و معروف واقعہ کہ جب عتبہ نے مبارزت طلب کی، تو پہلے تین انصاری جوان مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا، اور چلا کر کہا کہ "محمد یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں، ہم کو اپنے برادر عم زاد سے غرض ہے"، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے، اور آپ نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ اپنے عزیزوں کو مقابلہ میں بھیجا، کہاں یہ واقعہ اور کہاں واقدی کا یہ بیان کہ "عتبہ نے مبارزت طلب کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نیند چھائی جا رہی تھی، آپ سو گئے، اور پھر خواب دیکھا، اور حضرت ابوبکرؓ کے پکارنے سے پھر اٹھے۔

ابو داؤد میں اس واقعہ کی اصلی صورت موجود ہے۔

عن الساعدی قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم بدر اذا اکثبوکم فارموھم بالنبل ولا تسلوا السیوف حتی یغشاکم[1]، (کتاب الجہاد باب فی سل السیوف)	ساعدی سے روایت ہے، کہ آپ نے بدر کے دن فرمایا جب قریش تمہارے قریب آ جائیں تو ان کو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو جب تک کہ وہ تم کو چھا نہ لیں،

[1] اس معنی کی روایت صحیح بخاری، ج ۲، غزوۂ بدر میں بھی ہے،

عن علی قال تقدم یعنی عتبة بن ربیعة	حضرت علیؓ سے روایت ہے، کہ وہ یعنی عتبہ آگے
وتبعه ابنه واخوه فنادی من یبارز	بڑھا، اور اس کے پیچھے اس کا بھائی اور اس کا
فانتدب له شباب من الانصار	بیٹا آیا، اور عتبہ نے پکارا، کہ کون مقابل آتا ہے؛
فقال من انتم فاخبروه فقال لاحاجة	تو چند انصاری نوجوانوں نے اس کا جواب دیا
لنا فیکم انما اردنا بنی عمنا فقال	اس نے پوچھا، تم کون ہو، انھوں نے بتایا، اس نے
رسول الله صلی الله علیه وسلم	کہا، ہم کو تمھاری ضرورت نہیں، ہم کو اپنے چچازاد
قم یا حمزة، قم یا علی. قم یا عبیدة	بھائی چاہئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
قم یا حارث،	فرمایا، اے علی تم اٹھو، اے حمزہ تم اٹھو، اے
(ابوداؤد کتاب الجهاد)	عبیدہ تم اٹھو، اے حارث تم اٹھو،

کیا یہ کسی بزدل بے ہوش کے کام ہیں، پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں تیر لے کر مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا، اور ان کو برابر کیا، کیا یہ کسی بزدل اور بیہوش کا کام ہے، بدر کے ہیرو حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے بہادر شخص وہ سمجھا جاتا تھا، جو لڑائی میں آپ کے برابر کھڑا ہوتا تھا، کیا یہ کسی بزدل و بیہوش کا کام ہے؛ احد میں جب اکثروں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، کون کفار کے حملوں کا نشانہ اور اپنی جگہ پر قائم تھا؛ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ کسی بزدل کا کام ہے، حنین میں جب دس ہزار صحابہ نے تھوڑی دیر کے لئے قدم پیچھے ہٹائے، تو پہاڑ کی طرح کون اپنی جگہ پر جما رہا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایک غزوہ کی واپسی میں ایک منزل پر دوپہر کو جب تمام صحابہ مختلف درختوں کے سایہ میں آرام کر رہے تھے، اور ایک بدوی آپ ہی کی تلوار بے نیام کر کے آگے بڑھا، اور آپ سوتے سے جاگ پڑے، اور اس نے پوچھا، اے محمد اب تم کو اب کون مجھ سے بچا سکتا ہے، آپ نے جواب دیا، اللہ! اس نے یہ معجزانہ سکون اور طمانیت دیکھ کر تلوار نیام میں کر لی؛ تو یہ کارنامہ کسی بزدل کا ہے؟ یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ کسی کے خون سے رنگین نہیں کیا، مگر یہ پیغمبرانہ پاکی تھی، قلب کے ضعف اور دل کی کمزوری کی علامت نہیں تھی، واقدی نے یہ روایت بنا کر حقیقت میں قرآن مجید کی اس آیت پاک کی تفسیر کرنی چاہی ہے، جو واقعۂ بدر کے تعلق سے

---

[1] یہ واقعات حدیث اور مغازی کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔

نازل ہوئی تھی،

اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلاً وَلَوْ اَرٰکَهُمْ کَثِیْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ، (انفال)	یاد کرو جب خدا نے تجھ کو تیری نیند کی حالت میں ان لوگوں کو تھوڑا کر کے دکھایا، اور اگر ان کو زیادہ کر کے تجھے دکھاتا تو تم سست ہو جاتے، اور لڑائی کے فیصلہ میں باہم اختلاف کر لیتے،

واقدی نے اپنی جہالت سے اس خواب کے موقع کو عین معرکہ کا وقت سمجھ کر اس معجزانہ خواب کی روایت تیار کر لی، حالانکہ خود اسی حالت میں موجود ہے، کہ لڑائی کے متعلق فیصلہ ہو جانے سے پہلے ہی آنحضرتؐ کو یہ تمثیلی خواب دکھایا گیا تھا، جس میں ان کی تعداد کی کثرت کو نتیجہ کے لحاظ سے کم تعداد کر کے دکھایا گیا تھا، یعنی قریش کی شکست کی یہ پیشینگوئی عالم رویا میں دکھائی گئی تھی،

پروفیسر مارگیولیتھ صاحب نے اسی "فرضی واقعۂ بے ہوشی کے تذکرہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمزوری کے ثبوت میں ایک دو اور بے جوڑ باتوں کی تمہید کی ہے، وہ بھی سرتاپا لغو ہیں، پروفیسر صاحب کو واقعات کے بگاڑنے، واقعات کی غلط ترتیب دینے، اور اچھی سے اچھی بات کو بدنما صورت میں دکھانے میں یدطولیٰ حاصل ہے، جس کے لئے وہ عقل کے علاوہ صرف ونحو و ادب ولغت ہر فن کا خون کرنے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے ہیں، اس کی بدترین مثال ان کی کتاب کے ص ۰۷ میں ہے کہ،

> محمد خدیجہ کے ساتھ مل کر ہر رات کو سونے سے پہلے ایک خانگی عبادت ایک دیبی کی تعظیم میں کیا کرتے تھے:

موصوف نے اس کے لئے مسند ج ۴ ص ۲۲۲ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ مسند کی روایت محولہ میں بالکل اس کے خلاف واقعہ درج ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نہیں، بلکہ اہل عرب کا یہ دستور مذکور ہے، کہ وہ عزیٰ کی پوجا کر کے سویا کرتے تھے، عربی جاننے والوں کے لئے اصل روایت لکھی جاتی ہے،

حدثنی جار لخدیجۃ بنت خویلد انہ	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک ہمسایہ نے

سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو	مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ
یقول لخدیجۃ اے خدیجۃ	وسلم کو سنا کہ وہ حضرت خدیجہ سے فرما رہے تھے کہ
واللہ لا اعبد اللات	اے خدیجہ خدا کی قسم! میں لات وعزیٰ کی پرستش
والعزیٰ واللہ	نہیں کروں گا، خدا کی قسم نہیں کروں گا، حضرت
لا اعبد ابداً، قال فتقول خدیجۃ	خدیجہؓ کہتی تھیں، لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو
خل اللات خل العزیٰ قال کانت	جانے دیجئے، (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے) راوی
صنمھم التی کانوا یعبدون ثم	کہتا ہے کہ یہ قریش کا وہ بت تھا، جس کو وہ
یضطجعون،	پوجتے تھے، پھر لیٹتے تھے،

اللہ اللہ یہ کتنی بڑی تحریف ہے، ایک معمولی عربی کا واقف بھی سمجھ سکتا ہے کہ "صنمھم"، اور "کانوا یعبدون" اور "یضطجعون" میں جمع کی ضمیر ہے، جو اہلِ عرب اور قریش کی طرف پھرتی ہے، اور "وہ دو" یعنی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ) کی طرف نہیں پھر سکتی، انھوں نے بجائے عربی کے شاید انگریزی قاعدہ کے مطابق جمع کی ضمیر تثنیہ کی طرف پھیر کر ایک ایسی بات کہی، جو علمائے یورپ کے فضل و کمال کے دامن پر ہمیشہ داغ رہے گا،

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا،

افسوس کہ معارف کے مختصر صفحات اس سے زیادہ بحث کی گنجایش نہیں رکھتے، اس کے لئے سیرت کی پانچویں جلد کا جو خاص اسی موضوع پر ہے، ناظرین کو مطالعہ کرنا چاہئے۔

معارف ماہ جنوری ۱۹۲۶ء

پھر واقدی

امام زہری پر الزام،

پروفیسر گوئیم (درہم یونیورسٹی) انگلینڈ

کا

خط بنام ایڈیٹر اسلامک ریویو وکنگ

جناب من!

میں اسلامک ریویو کا باقاعدہ اور مستقل پڑھنے والا ہوں، فاضل سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون سے جو واقدی پر شائع ہوا ہے، مجھے نہایت دلچسپی ہوئی، کیا میں یہ درخواست کر سکتا ہوں، کہ آپ میرے اس خط کو مزید آگاہی کے لئے شائع کر دیں، جو حسب ذیل سوالات پر مشتمل ہے،

اول وہ کیا اصول ہے جس کی بنا پر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے، مہربانی کر کے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ میں مذہبی گروہوں کے اس حق کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا کہ وہ ان تحریروں کو جو میرے نزدیک لائق قبول نہ ہوں مستند ماننے سے انکار کر دیں، بلکہ میں وہ اصول جاننا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے، میں یقیناً جرح و تعدیل کے عظیم الشان لٹریچر اور مناد لہ وغیرہ کے مسائل سے واقف ہوں، لیکن واقدی ایک مورخ تھا، دینیات کا مصنف (تھیالوجین) نہ تھا، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے، کہ وہ نیک اور ولی تھا بخاری کی موت سے پچاس سال پہلے وفات پا چکا تھا،

یہ بھی آپ کے خیال سے دور نہ رہا ہوگا، کہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں، وہ ان سے جو اس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں

پھر آپ کے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے، کہ "ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشاپرداز، ایک جغرافیہ دان، یا ایک مورخ کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں پہنچا سکتی ہے،

اور ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی، اور کیا انکا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا،

یہ نہ سمجھئے کہ میں یہ سوالات مناظرہ کے لئے کر رہا ہوں، بلکہ زیادہ تر میں یہ سوالات اپنی زیر تالیف کتاب "روایات اسلام" کے چوتھے باب کے متعلق معلومات تلاش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، میرے خیال میں ابو حاتم کا واقدی کی نسبت بری رائے ظاہر کرنا درحقیقت موضوع سے خارج ہے، پھر ابراہیم حربی نے واقدی کے طرز تحریر یعنی ہر واقعہ کی الگ الگ سند لکھے بغیر روایت کی مدافعت کی ہے، یہ ایسا طرز تحریر ہے، جو یاد رہے کہ واقدی کی وفات کی ایک نسل بعد تک کم وقعت نہ تھا، کیونکہ زہری اور ابن اسحاق ان دونوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، آپکے فاضل مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ "زہری اور ابن اسحاق کی سطح واقدی سے بلند تر ہے" لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب (تھیالوجینس) کی نظر میں ان کی زیادہ وقعت ہے، لیکن مغازی میں ان کی وقعت کیوں زیادہ ہے؟ کیا یہ فراموش کر دیا گیا ہے کہ زہری نے خود اقرار کیا ہے، کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں، ۔

اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء،   اس پر ہم کو ان بادشاہوں نے مجبور کیا،

پھر بہت سے مصنفین نے صحیحین کی حدیثیں بھی رد کر دی ہیں، اور نیز یہ کہ بخاری کے راویوں میں سے ایک ابو ہریرہ بھی ہیں، جو روایت کرتے ہیں، کہ چاند پھٹ گیا تھا، (شق القمر) اس بنا پر کوئی اس خیال سے باز نہیں رہ سکتا، کہ کوئی قوی سبب اس کا نہیں ہے، کہ واقدی کو بخاری کے فیصلہ کی بنا پر رد کر دیا جائے،

اسلام کے ایک سچے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں نہایت مشکور ہونگا، کہ اگر سید صاحب یا کوئی دوسرا فاضل مجھ کو وہ اصول بتائے، جس کی بنا پر کسی ابتدائی مسلمان کی شہادت قبول یا رد کر دی گئی ہے۔

آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں، تو یہ بمشکل مناسب ہوگا کہ بعد کی نسل کے علمائے مذہب (تھیالوجینس) کی بلا دلیل راویوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہہ کر بدنام کیا جائے۔

آپ کا مخلص، الفرڈ گویم۔ پروفیسر عربی۔ درہم یونیورسٹی۔
انگلینڈ۔

الجواب

از

سید سلیمان ندوی

پروفیسر موصوف کے ان سوالات کو پڑھ کر سب سے پہلے اس بات کی خوشی ہوتی ہے، کہ ہمارے فاضل مستشرقین کی علمی تحقیق کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، ایک زمانہ تھا، کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لئے تنہا ابوالفدا ایک ماخذ انکے سامنے تھا، اس کے بعد واقدی اور پھر ابن سعد اور پھر ابن اسحاق کی باری آئی، یہاں تک کہ پروفیسر مارگولیوتھ نے اس کا سب سے بڑا ماخذ حدیث کو قرار دیا، اور خصوصًا ابن حنبل کی ضخیم جلدوں کو، لیکن ابھی تک اس کی کسر تھی، کہ انھوں نے کسی واقعہ کی تنقید میں اصول روایت سے کام نہیں لیا، مگر کیا پروفیسر گولیم کے ان سوالات سے یہ خوشخبری نہیں معلوم ہوتی، کہ وہ اب ہمارے ان اصول وضوابط کو سمجھنا چاہتے ہیں جن پر اسلام کی ابتدائی روایتوں کی تنقید کی اصلی بنیاد قائم ہے،

دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے، جس نے واقعات وروایات کی تنقید وتصحیح کے لئے اصول وضوابط قائم کئے، اور اس سلسلہ میں اصول حدیث، اسماء الرجال، علم الجرح والتعدیل، اختلاف الحدیث، اور اسناد وغیرہ متعدد فنون کی بنیاد ڈالی، اسی کے ساتھ درایت کے اصول اور نقد کے قوانین بنائے، اور ان پر صدہا کتابیں لکھیں، اور وہ ہماری مشرقی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کا ایک جزء ہیں، اور محض عربی زبان کی ادبی واقفیت ان مشکلات کی گرہ کشائی نہیں کرسکتی، ۔

مسلمانوں میں اس فن کے رو سے واقعات کی تنقید دو پہلوؤں سے کی جاتی ہے، جن میں سے ایک اصول روایت اور دوسرا اصول درایت ہے، روایت کے مختصر اصول یہ ہیں، کہ شروع سے آخر تک واقعہ کے ناقل اور راوی معتبر اور ثقہ ہوں، پہلا راوی یا خود واقعہ کے وقت موجود اور اس کا عینی شاہد ہو، یا کسی شریک واقعہ اور عینی شاہد سے اس نے خود سنا ہو، یا اس کے متعلق بتجربہ سے ثابت ہو کہ وہ ہمیشہ عینی شاہدوں سے سن ہی کر اس قسم کی روایتیں کیا کرتا ہے، پھر یہ کہ ہر راوی یہ اقرار کرے کہ اس نے خود دوسرے راوی یعنی اپنے پیشرو راوی سے یہ سنا ہے یا یہ ثابت ہو کہ وہ اس سے عمر میں کم سے کم ایک دفعہ بھی ملا ہے، یا یہ کہ وہ دونوں کم از کم ایک زمانہ

ہیں موجود تھے، اور ایک کی دوسرے سے سماعت ممکن ہے، اوّل سے اخیر تک سند کی کڑی متصل اور ملی ہو کہیں سے ٹوٹی نہ ہو، یعنی بیچ کا راوی کوئی نامعلوم شخص نہ ہو،

درایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ دیگر مستند تاریخی بیانات کے مخالف تو نہیں ہے، کسی دوسرے صحیح تر سند سے اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت تو موجود نہیں ہے، جو اس کی تکذیب کرتی ہو، راوی سے مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے، راوی نے کوئی ادھوری بات تو نقل نہیں کی ہے، اسلام کے مسلمہ متیقنہ اور معروف اصول کے خلاف تو نہیں ہے؟

یہ اس فن کی مختصر دفعات ہیں، جن پر اسلام کی ابتدائی تاریخ و احکام کی نقل و روایت کی بنیاد قائم ہے، اسلام کے ابتدائی مصنفین نے خواہ علمائے حدیث ہوں، علمائے مغازی ہوں، یا علمائے تاریخ ہوں، انہی اصول کی پیروی جہاں تک زیادہ کی ہے، وہیں تک ان کی تصنیفات امت کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہوئی ہیں، اسی بنا پر امام بخاریؒ کی جامع صحیح کا، پھر امام مسلم نیشاپوری کی کتاب کا، پھر علی الترتیب اسی طرح حدیث کی دوسری کتابوں کا درجہ ہے،

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی روایت متن کتاب میں نقل نہیں کی ہے، جس میں ہر ایک راوی نے دوسرے راوی سے اپنی ملاقات اور سماعت کا اقرار نہیں کیا ہے، امام مسلمؒ نے ایسے راویوں کی روایتیں بھی قبول کرلی ہیں، جن کی باہمی ملاقات اور سماعت کا ثبوت کوئی نہ ہو، مگر اتنا ثابت ہو کہ وہ دونوں ایک عہد اور ایک زمانہ میں موجود تھے، اس بنا پر ایک منصف مزاج یہ یقین کرے گا، کہ روایات اور وقائع کے تمام دفتر میں صحیح بخاری سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا، کہ صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری کے بعد کیوں قرار دیا گیا ہے، دوسری کتابوں کے مصنفین نے اپنا اصول یہ قرار دیا ہے، کہ وہ ہر اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں، جس کی نسبت علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا نہیں ہے، اور ہر اس راوی کو قبول کیا ہے، جس کو علماء نے جھوٹا، کاذب اور دروغ گو نہیں کہا ہے، نیچے درجہ کے مصنفین نے اس اصول کو بھی برقرار نہیں رکھا ہے، بلکہ ہر جھوٹی سچی روایت کو قبول کرکے اپنی کتاب میں بھر دیا ہے، اس لئے اسی ترتیب سے ان کی کتابوں کے بھی اہل فن نے درجے مقرر کر دیئے ہیں۔

جو کتابیں مغازی اور سیرۃ پر لکھی گئی ہیں، ان میں ان اصولوں کا عموماً بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے، تاہم ان اصولوں کی پابندی اور خود مصنفین کی ذاتی حیثیت کی بنا پر مغازی کی کتابوں میں سب سے اول امام زہری کی مغازی کو جگہ دی گئی تھی، اور اس کی عدم موجودگی میں ان کے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا رتبہ ہے، اور اس کے بعد ان کے ہم درس محمد بن اسحاق کا درجہ ہے، اور واقدی کے لئے اس دربار میں وہی جگہ رکھی گئی ہے، جو اسی کے ہم رتبہ کسی حدیث کی کتاب کے مصنف کا پایہ محدثین میں ہے،

پروفیسر صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمائے اسلام کی جماعتی یا فن وار تقسیم سے ناآشنا ہیں، اور یقیناً کسی بیرونی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے مذہب، علوم اور زبانوں کی اصطلاحات کا سمجھنا اس بنا پر مشکل ہوتا ہے، کہ وہ بچپن سے اس ماحول سے باہر پلے ہیں، اور ان کی واقفیت کا ذریعہ محض کتابیں ہیں، اور ان چیزوں کے پوری طور سے سمجھنے میں اس قوم کی زبان کی محض ادبی واقفیت پوری نہیں ثابت ہوتی، اس لئے لامحالہ وہ شخص دوسری قوم کی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کو اپنی قومی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کے مطابق کر کے سمجھتا ہے، ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے خط میں دو قسم کے علماء کے نام لئے ہیں، ایک کو وہ تھیالوجینس یعنی علمائے الٰہیات اور دوسرے کو مورخین اور اصحابِ مغازی کہتے ہیں، لیکن اسلام میں یہ کوئی تقسیم نہیں ہے، اور ہمارے یہاں علمائے الٰہیات، عام علماء سے کوئی الگ نہیں ہیں، یہاں پر علماء کی تقسیم تھیالوجی (الٰہیات) کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ "روایت" کی بنا پر ہے، اس لئے وہ تمام اشخاص جو کسی قسم کی نقل و روایت کرتے ہیں، ایک جنس میں داخل ہیں، اور ان کا نام "علمائے نقل" ہے، اور دوسرے "علمائے عقل" ہیں جن کا یہاں کوئی تعلق نہیں،

علمائے نقل یعنی وہ تمام اشخاص جو کسی حکم یا واقعہ کو نقل و روایت کرتے ہیں، ان کے اس حکم و واقعہ کی جنسیت کی بنا پر مختلف نام ہیں، مثلاً وہ اشخاص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد اول کے ہر قسم کے احکام و واقعات کی نقل و روایت کی خدمات انجام دیں، وہ محدث کہلاتے ہیں، اور جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ذاتی اور واقعات و اخلاق کا ذکر کریں، وہ اصحابِ سیرۃ ہیں، اور جو آپ کے صرف اخلاق و عادات کو نقل کریں وہ اصحابِ شمائل ہیں، اور جو صرف غزوات، اور ان کے متعلقات کو بیان کریں، وہ اصحاب المغازی ہیں، بہرحال محدث یا صاحبِ سیرت، یا صاحبِ شمائل، یا صاحب المغازی، یہ کل کے کل گو متعلقہ مضامین کی حیثیت سے

الگ الگ ناموں سے موسوم ہیں، لیکن روایت کی حیثیت سے ان سب کا ایک ہی درجہ ہے، یعنی یہ سب اصحابِ روایت اور علمائے نقل ہیں، اور تمام اصحابِ روایت اور علمائے نقل ایک ہی ترازو کے پلہ میں تولے جائیں گے۔

اس بنا پر، جو شخص بھی اسلامی روایات کا کوئی ٹکڑا بھی کسی سے نقل کر کے بیان کرے گا، خواہ وہ دینی احکام و فرائض سے متعلق ہو، خواہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہو، خواہ وہ غزوات اور لڑائیوں کے بارہ میں ہو، خواہ وہ آپ کے اخلاق و عادات سے تعلق رکھتا ہو، اس کے لئے اس بات کے ثبوت کی ضرورت ہے، کہ درحقیقت یہ ایسا ہی ہے، عقلِ انسانی بھی پچھلی نسلوں یا غائب اشخاص کو اس حکم یا واقعہ کا علم صرف روایت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اور ایک انسان کے ہاتھ میں یہی ایک ذریعہ ایک سے دوسرے تک بات کے پہنچانے کا ہے، اور تمام دنیا کے وقائع اور حوادث کے علم کا مدار صرف تاریخ پر ہے،

اسلامی اور غیر اسلامی روایات میں فن کی حیثیت سے یہی سب سے بڑا اور ممتاز فرق ہے، کہ غیر مسلم قوموں نے اپنے انبیاء، اور ہادیوں کے اقوال، اور افعال کی روایتوں کی جانچ اور پڑتال کے متعلق کوئی اصول مدون نہیں کیا ہے، اور مسلمانوں نے اس کے لئے بہت سے اصول مدون اور منضبط کئے ہیں، اور اسی معیار پر غلط اور صحیح سچی اور جھوٹی روایت کو وہ پرکھتے ہیں، مثلاً ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں، ان چار مشہور انجیلوں کے علاوہ اور بہت سی انجیلیں ہیں، مگر انھوں نے چار کو مسلم مان کر بقیہ کو جعلی اور ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے، مگر ہمیں وہ اصول نہیں معلوم جن کی بنا پر اس جھوٹ اور سچ، صحیح اور جعلی میں فرق کیا جا سکے، لیکن مسلمانوں کے پاس ان کے جانچنے کیلئے وہ فن ہے، جس کا نام اصول ہے، اور جس کی متعدد شاخیں ہیں،

آج تنقیدی تاریخ کے فن نے یورپ میں بے انتہا ترقی کی ہے، اور ابن خلدون کے بنیادی فلسفۂ تاریخ نے یورپ جا کر عظیم الشان برگ و بار پیدا کیا ہے، اور اس امر پر بڑا زور صرف کیا جاتا ہے، کہ اس تاریخ کا فلاں واقعہ فطرت، مقتضائے عہد اور اس زمانہ کے ماحول کے لحاظ سے ممکن بھی ہے، یا نہیں، غرض درایت کے نقطۂ نظر سے کوئی پہلو جدید یورپ کے نقاد مورخین کی محققانہ نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، لیکن یہ پہلو کہ اس واقعہ کو کس نے دیکھا، کس سے سنا، ہم تک کس واسطے سے پہنچا، کبھی معرضِ بحث میں نہیں آتا، آج یورپین محققین اور عدالتوں نے حوادث اور واقعات میں شہادت کی حیثیت کو جو اہمیت دی ہے، وہ مخفی نہیں ہے، اور شاہدوں اور

گواہوں کی وقعت، پوزیشن، اخلاق، عینی شہادت اور سچائی کو ہر طرح سے جانچنے کی انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں، پھر یہ کیا ظلم ہے، کہ موجودہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں تو شاہدوں اور گواہوں کے متعلق یہ احتیاط برتی جائے اور گذشتہ واقعات کے قبول ورد میں اس کے بالمقابل شہادت کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور سچے اور جھوٹے میں کوئی فرق نہ کی جائے، نہ اس کی تلاش اور جستجو کی جائے،

حدیث وروایت بھی دنیا کے ہزاروں علوم وفنون میں سے ایک فن ہے، ہر علم وفن کی طرف جو لوگ منسوب ہیں، یا جو کسی علم وفن کی آگاہی اور واقفیت کے مدعی ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا سب درجہ برابر نہیں ہوتا، بہت سے ان میں محض فن کے آشنا اور اس علم کے محض ابجد خوان اور حرف شناش ہوتے ہیں، دوسروں کی حالت ان سے بہتر ہوتی ہے، بعض کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے، اور کچھ ایسے باکمال بھی ہوتے ہیں، جو اس علم یا فن کے محقق، اس کو ترقی دینے والے، اس کے تمام حقائق اور اسرار کے کامل ماہر ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ کہ اس کو اس علم یا فن میں نقص یا کمال کا کونسا درجہ حاصل ہے، اس علم وفن کے متعلق اس کے کارنامے اس کے ہم عصر وہم پیشہ فضلاء کی رائیں اور اس زمانہ کے قبولِ عام کی نگاہیں اس کو نمایاں کر دیتی ہیں، اور بالآخر ان کو اس علم وفن کا معیاری درجہ اور رتبہ حاصل ہو جاتا ہے، ہر عہد اور ہر زمانہ میں علم وفن کی ہر شاخ میں اس کی ہزاروں مثالیں گذر چکی ہیں، اور گذر رہی ہیں، گذشتہ اور موجودہ علماء اور مصنفین کے اعتبار، استناد اور صحت نقل کا پیمانہ اسی معیار پر قائم ہے،

یہی اصول اسلامی روایت کے حاملین اور ابتدائی مسلمان مصنفین کے فرقِ مراتب اور امتیازات میں قائم ہے، جس کی بنا پر مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن حنبل، ابن ماجہ، ابن اسحاق، واقدیؔ ابن سعد، ابن ہشام، طبری، دیلمی، کلبی وغیرہ ابتدائی مسلمان مصنفین کی کتابوں میں مراتب اور درجات ہیں،

ہر علم وفن کے مسائل کے متعلق اس کے جاننے والوں اور محققوں ہی کی رائے معتبر ہو سکتی ہے، ایک عالم لغت کی رائے، کیمسٹری کے کسی مسئلہ کی نسبت یا ایک جغرافیہ دان کی رائے، طب کے متعلق، ایک ادیب کی رائے ما بعد الطبیعیات کے بارہ میں یا ایک محدث کی رائے ہیئت کے کسی مسئلہ کے فیصلہ میں بالکل بے سود ہے، مسلمان علماء اور حکماء میں ابوالقاسم حریری سے ریاضیات کی نسبت اور موسیٰ خوارزمی سے مقامات کی نسبت سوال بے کار ہوگا،

بو علی سینا سے حدیث کی تحقیق اور امام بخاری سے طبیعیات کے مسائل حل نہیں کئے جا سکتے، اس لئے یہ کھلی ہوئی بات ہے، کہ حدیث و روایت نبوی کی تحقیق میں "ایک انشا پرداز، جغرافیہ داں اور مغازات نویس کی رائے کیوں معتبر نہیں، جس طرح گبن کا کام نیوٹن سے نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح ابن حجر کا کام یاقوت سے نہیں لیا جا سکتا اور نہ یاقوت کا کام ابن حجر سے لیا جا سکتا ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ "ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشا پرداز جغرافیہ داں اور ایک مورخ (یاقوت) مورخ نہیں سوانح نگار تھا) کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی"۔

اس کے فیصلہ کے بارہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تھیالوجین (عالم الہیات) اور غیر تھیالوجین کے تعصب کی دیوار حائل ہے، بلکہ فن کی واقفیت اور تحقیق کی دیوار حائل ہے۔ کسی شہر کی جائے وقوع، اور اس کے نام کی صحت کے بارے میں ابن خردازبہ، مقدسی، مسعودی، ادریسی اور یاقوت جغرافیہ دانان اسلام کی جو رائے ہوگی، اس کے مقابلہ میں امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، خطابی اور ابن حجر کی رائے قابلِ تسلیم نہ ہوگی، یہ بالکل ایک کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اس لئے آپ کی یہ حیرت کہ "ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی۔ اور کیا اس کا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا" دور ہو جائے گی۔

اب میں آپ کے اس سوال پر آتا ہوں کہ "وہ کیا اصول ہے، جس کی بنا پر واقدی کی صداقت روکی جاتی ہے" اور وہ اصول عرض کرنا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے، پہلے گذر چکا ہے کہ ہر علم و فن کے فضلاء اور محققین کے کارنامے معاصرانہ شہادتیں، اس علم و فن کے ساتھ اس کا شغف و شوق اور کاوش و تحقیق ان کے مرتبہ اور درجہ کو متعین کر دیتی ہے، اور ایک ناآشنائے فن عطائی مدعی محض عالم، فاضل اور محقق کامل کے متفاوت درجوں کی تعیین کر دیتی ہے، یہی حال سلسلۂ روایت اور اسناد کے واقفوں، عالموں اور محققوں کے رتبوں اور درجوں کی تعیین اور تشخیص کا ہے۔ امام بخاری کے سامنے بغداد میں روایات کے دس متفرق سلسلے باہم الٹ پھیر کر امتحاناً پیش کئے جاتے ہیں، وہ بہ ترتیب ان سلسلوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر پیش کر دیتے ہیں، اور علماء کا مجمع انکی حیرت انگیز یادداشت اور حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، اس بنا پر اس فن میں امام بخاری کا جو درجہ ہوگا،

وہ اس واقدی کا نہیں ہو سکتا، جس کو اپنی کسی روایت کی پوری سند بھی نہیں معلوم،

اول نفس مصنفین کو لیجئے، فضل وکمال، دیانت وتقویٰ، حفظ ویادداشت، فہم واستنباط کے لحاظ سے ان میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے، پھر آپ کو معلوم ہے کہ کم ازکم ایک دو نسل تک اسلامی روایات کا بڑا حصہ زبانی کتاب کے سبقوں کی طرح رٹ کر یاد کیا جاتا تھا، اس لئے راویوں کی قوتِ حافظہ کا امتحان بھی ضروری تھا،

اب اسلامی فنِ روایت کے اصول کی بنا پر کسی مصنف کی کتاب میں کسی واقعہ کے مستند طور سے درج ہونے اور اس کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے، کہ

۱۔ مصنف خود معتبر، ثقہ، دیانت دار، اور صادق القول، اور اپنی روایتوں کے تمام سلسلوں سے واقف ہو، اور اپنے راویوں کے انتخاب میں اس نے پوری کوشش کی ہو، اور کامیابی حاصل کی ہو،

۲۔ اس کی ہر روایت کا سلسلۂ سند ہو،

۳۔ اس کی روایت کا ابتدائی راوی واقعہ کا عینی شاہد ہو، یا کسی عینی شاہد سے اس کے سننے کا کافی ثبوت ہو،

۴۔ واقعہ کے شاہدِ عینی سے لے کر مصنف تک ہر دور کے راوی کی کڑی موجود ہو،

۵۔ ہر دور کے راوی کی نسبت یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ثقہ، معتبر اور صادق ہو،

۶۔ ہر دور کے راوی کی نسبت ثابت ہو کہ اس نے اپنے پیشرو سے سنا ہے اور یا کم ازکم دونوں ایک زمانہ میں موجود تھے،

یہ چند اصول ہیں جو ایک ایسے مختصر مضمون کی چند سطروں میں بیان کئے جاسکتے ہیں، اس معیار پر ہم بخاری اور واقدی کی روایتوں کو جانچتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے، کہ بخاری کے تمام معاصرین بالاتفاق اس کو ثقہ، معتبر، صادق متدین اور روایت کے اشخاص اور رجال کا سب سے بڑا پرکھنے والا کہتے ہیں، اور دوسرے کے اکثر معاصرین اس کو جھوٹا کاذب اور دروغ گو اور روایت کے اشخاص ورجال سے اس کو نابلد محض کہتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے،

اب ان دونوں کے راویوں کا حال ہم دیکھتے ہیں، تو پاتے ہیں کہ بخاری اپنی ہر روایت کے شروع سے اخیر تک راویوں کے نام بنام گناتے ہیں، اور ان میں سے اس کے ہر دور کا راوی اپنے زمانہ کا مشہور ومعروف متدین،

راست باز اور معتبر تھا، دوسری طرف واقدی کے یہاں سرے سے یہی معلوم نہیں کہ اس نے واقعہ کو کس سے سنا، اس نے کس سے کہا، اور اس کا شاہد عینی کون تھا؟ اس لئے ایسی حالت میں ہر منصف مزاج، روایت کے دونوں مصنفوں کے بیانات کے رد و قبول کا بآسانی فیصلہ کر سکتا ہے،

واقدی نے اگر کہیں کہیں ایک دو راویوں کے نام لکھے بھی ہیں، تو وہ غیر مشہور، نامعتبر یا مجہول ہیں، اور بخاری کا ہر راوی اپنی جگہ پر معاصرین میں مسلم الثبوت اور اہل فن کے نزدیک مستند رہا ہے، پھر نفس واقعہ اور اس کی تفصیلات کو دیکھتے ہیں، تو ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کے بیان کی تصدیق دوسری معاصر و مماثل روایتوں کی تائید سے بھی ہوتی ہے، اور واقدی کے خاص بیان کی تائید کسی معاصر سے نہیں ملتی، اس قسم کی متعدد مثالیں جب دو مصنفوں میں ملیں گی، تو ضرور ایک کو مستند اور دوسرے کو غیر مستند قرار دیا جائے گا" یہ اصول ہے جس کی بنا پر ایک مصنف کو قبول اور دوسرے کو رد کیا جاتا ہے،

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے ممتاز و مستند محققین ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اسلامی علم روایت کے ممتاز و مستند محققین بھی ہر دور میں گذرتے رہے ہیں، جن کا تدین، جن کی ثقاہت، جن کا علم و فضل خود ان کے کارناموں، علمی کاوشوں، ان کی زندگیوں کے سوانح اور ان کے معاصرین کی شہادتوں سے ثابت ہے، اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ، روایتوں کی تحقیق، راویوں کی چھان بین، رجال کی تلاش و تفتیش میں بسر کیا، اور ان کے عہد کے انسانوں نے ان کے تدین، تحقیق اور فضل و کمال پر بھروسہ کیا، ان کی تحقیقات اور بیانات اس عہد کے راویوں کے متعلق معیار قرار پائے،

اور چونکہ مختلف اشخاص کے متعلق ان کے مختلف واقف کاروں کے تجربے کبھی کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں، اس لئے راویوں کے متعلق مختلف رائیں بھی ہیں، ان راویوں کی صحت کا معیار خود ان اصحاب رائے کا فضل و کمالی ہے، اور یہ اختلاف رائے خود علم اسماء الرجال کی صداقت کی دلیل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعی مختلف اشخاص کے ذاتی تجربوں پر قائم ہے، اگر ان میں بجائے اختلاف کے یکسانی ہوتی، تو اول تو یہ اشخاص کے متعلق نقد و تجربہ کی غیر فطری مثال ہوگی، دوسرے اس سے شبہہ پیدا ہو سکتا تھا، کہ یہ ایک جعلی، بناوٹی اور منفقہ جھوٹ ہے، اس بنا پر کسی راوی کے متعلق اگر مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں، تو ان راویوں میں سے کسی ایک پہلو کی ترجیح کیلئے

حسب ذیل اصول ہیں،

۱۔ معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے؟

۲۔ مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں،

۳۔ عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے؟

کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اس کی بنا حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے،

۱۔ راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے، اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر کس قسم کی باتیں ملتی ہیں؟

۲۔ دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اس کا بیان کہاں تک موافق یا مخالف ہے؟

۳۔ اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلا کی رائیں اس کے متعلق کیا ہیں، اور اگر وہ مختلف ہیں، تو ان میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں، یا ان کی کثیر تعداد کس جانب ہے،

۴۔ متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا، مگر اس کے متعلق اس نے اپنے شیوخ کی زبان سے سنا جو اس راوی کے معاصر تھے،

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ واقدی کے متعلق پچاس برس بعد امام بخاری کیونکر اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں،

واقدی کے متعلق ابو حاتم رازی کی رائے موضوع سے خارج ہے۔ ابو حاتم کا منشا یہ ہے، کہ واقدی کے ہم عصر محدثین اور فضلائے روایت نے دیکھا، کہ واقدی مدینہ کے نامعلوم اور غیر معروف راوی جن کے حالات سے واقفیت نہیں، ان سے روایت کیا کرتا ہے۔۔۔ اور ایسی روایتیں کرتا ہے، جو منکر ہیں یعنی کسی ثقہ اور معتبر راوی کے بیان سے ان کی تائید و تصدیق نہیں ہوتی، اور نہ جن کو ہم جانتے ہیں، اب ایسی حالت میں یہ اشتباہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ منکر اور غیر مصدقہ روایتیں خود واقدی نے گھڑ لی ہوں اور دوسرے غیر معروف شیوخ کی طرف ان کو منسوب کر دیا ہو، یا یہ کہ جھوٹی روایتیں انہی غیر معروف شیوخ کی ساختہ ہوں، اور واقدی نادانستگی میں ان کو لے کر بیان کیا کرتا ہے، شک کے ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کی تعیین واقدی کے ہم عصر فضلا نے اس طرح

کی کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ معروف و مشہور اساتذہ جو اس قسم کی منکر روایتیں ہرگز نہیں کرتے، اور نہ انھوں نے کی، واقدی ان سے بھی اس قسم کی روایتیں علانیہ ان کی طرف نسبت کرکے کیا کرتا ہے، اس سے معلوم ہوگیا، کہ ان لغو و مہمل اور غیر مصدق روایتوں کے گھڑنے کا کارخانہ خود اسی کے گھر میں قائم تھا،

کیا یہ موضوع بحث سے خارج رہتا ہے،

ابراہیم حربی جنھوں نے واقدی کی حمایت کی ہے، اور کہا ہے، کہ

"مفصل سند کے بغیر روایت کرنا اگر جرم ہے، تو امام زہری اور محمد بن اسحاق بھی اس سے بری نہیں"

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں اس کے دو جواب دیئے ہیں،

۱۔ زہری اور ابن اسحاق واقدی سے بہت زیادہ بلند ہیں، اس لئے ان کی بلاسند بات بھی واقدی کی بے سند بات سے زیادہ وقیع ہے، کہ واقدی کا جعل سازی ثابت تھا، اور وہ دونوں اس الزام سے قطعاً بری ہیں، اور خصوصاً زہری تو امام الائمہ ہیں، اور ابن اسحاق گو ان سے بہت کم رتبہ ہیں، تاہم واقدی سے ان کا پایہ بلند ہے،

۲۔ زہری اور ابن اسحاق نے ایسی بے سند بات کبھی نہیں کہی، البتہ کہیں کہیں مختلف سندوں کو ایک جگہ ملا کر روایت کی ہے، بقیہ ہر جگہ انھوں نے اپنی ہر بات اور روایت کی الگ الگ سندیں ذکر کی ہیں، اور واقدی نے یہ کیا ہے، کہ ایک جگہ کتاب کے آغاز میں سو پچاس آدمیوں کے نام اکٹھا کرکے باقی پوری کتاب بلاسند ایک کہانی اور ایک قصہ کی طرح سنادی ہے، اس لئے ان میں عظیم الشان فرق ہے،

علاوہ ازیں اگر زہری اور ابن اسحاق نے واقدی ہی کی طرح کوئی بے سند روایت کردی ہے تو اس کا درجہ بھی واقدی ہی کی روایت کے قریب قریب ہوگا، گو زہری اور واقدی کے ذاتی امتیاز اور فضل و کمال کا جو فرق ہے۔ وہ اب بھی محسوس ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ مغازی کی کتابوں کا درجہ احادیث کی کتابوں سے فروتر ہے واقدی ہی کی مغازی کی تخصیص نہیں، مغازی کی ہر کتاب احادیث کی کتاب کے مقابلہ میں کم رتبہ ہے،

پھر آپ میری نسبت کہتے ہیں کہ "آپ کے مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحاق کی سطح واقدی سے بلند ہے، لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں" آپ یقیناً پوچھ سکتے ہیں، یہ سطح کا نشیب و فراز اس لئے ہے، کہ امام زہری کا کوئی جھوٹ ثابت نہیں ہوا، محمد ابن اسحاق بھی اس الزام سے بری رہے ہیں، گو ان پر بے احتیاطی کے

اور الزامات ثابت ہوں، اور واقدی کی نسبت ان کے معاصرین کا بار بار کا یہ تجربہ ہے کہ وہ جھوٹی گھڑ کے اور بے احتیاطی سے روایت کیا کرتا تھا، زہری ہمیشہ راویوں سے اپنی روایتیں کرتے ہیں، جو اپنے عہد کے مشہور و معروف و ثقہ تھے، محمد بن اسحاق ان سے کم درجہ کے اور واقدی بالکل غیر معروف اور مجہول لوگوں سے روایتیں کرتا ہے، اور اس اصول کی بنا پر کہ ہر علم و فن کے واقف کاروں اور ماہروں کے تفاوتِ مدارج کی نسبت ہر زمانہ کے علما فیصلہ کیا کرتے ہیں، زہری اور ابنِ اسحاق اور واقدی کی سطح کی بلندی اور پستی کا فیصلہ بھی انہی نے کیا ہے۔ تاہم سند کے لحاظ سے زہری کی بھی ہر قسم کی روایتیں یکساں نہیں ہیں، اور ان کی بے سند روایت بھی مستند روایت کے مقابلہ میں چھوڑ دی جائے گی، یا کم سمجھی جائے گی،

آپ کہتے ہیں کہ "میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب (محفیا لوجینیس) میں ان کی (زہری اور ابن اسحاق کی) وقعت زیادہ ہے، لیکن مغازی میں ان کی وقعت کیوں زیادہ ہے"، اوّل عرض یہ ہے کہ زہری تو بلاشبہ ہر صنف روایت میں اعتبار و استناد کے بلند ترین درجہ پر ہیں، مگر ابن اسحاق کا یہ حال نہیں ہے، وہ صرف مغازی میں مقبول ہیں احکام میں دوسرے معتبر لوگوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے، بہرحال آپ کے اس سوال کہ "مغازی میں زہری اور ابن اسحاق کی وقعت واقدی سے کیوں زیادہ ہے" کے متعلق کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی اصولِ روایت میں مغازی اور غیر مغازی کا کوئی فرق نہیں ہے، ہر وہ شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی بات نقل کرتا ہے، اس کو اسی مقررہ اصول پر جانچا جائے گا، خواہ وہ لڑائیوں کا حال ہو، یا اخلاق کا بیان ہو، یا کسی مذہبی حکم کا اظہار ہو، گو یہ سچ ہے کہ محدثین نے عملاً جانچ پڑتال کی وہ سختی اور شدت مغازی اور فضائل کے باب میں اتنی نہیں کی ہے جتنی احکام کے باب میں کی ہے، اور اس کا انھوں نے علانیہ اقرار کیا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے، کہ مغازی اور فضائل میں کثرت سے لوگوں نے فضول اور لغو روایتیں شامل کر دی ہیں، اور فن کے ناآشناؤں میں وہ مقبول اور عوام میں دل پسند ہیں،

واقدی کی مدافعت میں تین باتیں کہی گئی ہیں،

۱ - واقدی کی وفات سے ایک نسل بعد کا طریقۂ روایت یا طرزِ تحریر، (یعنی حذفِ اسناد یا خلطِ اسناد کا طریقہ) قابلِ اعتراض نہ تھا، -

۲۔ امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی ایسا ہی کیا ہے، پھر وہ کیوں واقدی کے مقابلہ میں معتبر اور مقبول ہیں؟
۳۔ امام بخاری پر بھی لوگوں نے جرحیں کی ہیں، پھر وہ کیوں غیر معتبر نہیں۔ اور ان کو اس کے بعد کیا حق رہتا ہے کہ واقدی پر معترض ہوں۔

گو میں اپنے سابقہ بیانات میں ضمناً ان سوالات کا جواب دے چکا ہوں۔ مگر براہ راست بھی دیدینا چاہتا ہوں۔

۱۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ واقدی کی ایک نسل بعد تک یہ طرز تحریر قابل اعتراض نہ تھا، جن لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے، وہ اس کے معاصر ہی تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خود اس کے عہد میں یہ طرز ناپسندیدہ تھا، زہری اور ابن اسحاق کے طرز عمل سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اور آگے پھر لکھتا ہوں۔

۲۔ زہری نے کہیں کہیں ساری روایتوں میں دس پانچ جگہ ایسا کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اس سے زیادہ ایسا کیا ہے لیکن واقدی نے پوری کی پوری کتاب اس طرز پر لکھ ڈالی ہے۔ اس لئے اگر زہری اور ابن اسحاق کی صرف چند روایتیں جو اس طرز پر ہیں، قابل اعتراض ہیں، تو واقدی کی پوری کی پوری کتاب قابلِ اعتراض ہے، واقدی نے جہاں جہاں سندیں لکھی ہیں، ان کو کہیں ایک جگہ بھی اصل اخیر شاہد عینی تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہے یہاں تک کہ زہری کی روایتوں کا بھی اس نے یہی حال کیا ہے۔

زہری باوجودیکہ امام الائمہ اور تمام محدثین کے شیخ اعظم ہیں، تاہم ان کی مرفوع و متصل روایتوں کا جو مرتبہ ہے، وہ ان کے مراسیل اور بلاغات کا نہیں ہے۔ اور وہ بھی اسی طرح کم وقعت ہیں جس طرح دوسروں کی غیر مرفوع اور غیر متصل روایتیں صرف اتنا فرق ہوگا کہ چونکہ زہری بذات خود معتبر ہیں، اور واقدی جھوٹا، کاذب اور جعل سازی، اس لئے زہری کی بے سند روایت کا اعتبار واقدی کی بے سند روایت سے زیادہ ہوگا۔ اور یہ وہی فرق ہے، جو ایک صادق البیان مورخ اور ایک عامی گپ ہانکنے والے مصنف میں تمام دنیا کرتی ہے۔

۳۔ امام بخاری پر دارقطنی وغیرہ نے بیشک اعتراضات کئے ہیں، لیکن وہ اعتراضات صرف فضل و کمال کی نمائش کے لئے محض اصطلاحی اور لفظی (ٹکنیکل) ہیں۔ واقعی نہیں ہیں، اسی لئے وہ اعتراضات علماء کے نزدیک ناقابل قبول ٹھہرے۔ اور ابن حجر نے مقدمہ میں ان میں سے ایک ایک اعتراض کو رد کر دیا ہے، علاوہ ازیں کسی نے

یہ جرأت نہیں کی ہے، کہ واقدی کی طرح بخاری کو جھوٹا اور دروغ گو کہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بخاری کے چند راویوں کی معتبری اور نامعتبری پر بعض لوگوں کو اعتراضات ہیں، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ ان معترضین کے نزدیک بخاری کی وہ روایتیں قابلِ اعتراض ٹھہریں گی، مگر اس سے یہ الزام نہیں آئے گا، کہ بخاری کی چھ ہزار روایتیں دفعۃً معیار سے گر جائیں، برخلاف واقدی کے کہ اس کی ہر غیر مصدق روایت پایۂ اعتبار سے ساقط اور نامعتبر ہے،

بخاری کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے آپ نے لکھا ہے، کہ اس کے راویوں میں سے ایک ابوہریرہؓ ہیں، جنھوں نے شق القمر جیسا واقعہ نقل کیا ہے، یہ طرز استدلال تو صحیح نہیں، ورنہ دنیا کے ہر مذہب کا مجموعۂ روایت ناقابلِ تسلیم ہو جائے گا "خواہ وہ نبوت کے ستارہ کا طلوع ہو، یا کسی کی موت کے وقت دنیا جہان کا تین دن تک اندھیرا ہو جانا" ہو، اور اس کے علاوہ سیکڑوں، ہزاروں معجزات ہیں، چاند کا پھٹنا، یا پانی پر چلنا عقلاً ممکن ہے یا نہیں، اور روٹی اور مچھلی کے چند ٹکڑے سیکڑوں انسانوں کو بیک وقت سیر کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اس کی بحث کا یہ موقع نہیں، میں نے اپنی سیرت نبویؐ کی تیسری جلد میں اس پر پوری بحث کی ہے، اور ہیوم کے فلسفہ (معجزات) سے متفق ہوں، کہ معجزات ممکن ہیں، بشرطیکہ ان کا ثبوت قطعی شہادت سے ہوسکے، لیکن بحث اس موقع کے لئے موزوں نہیں ہے، بہر حال آپ بھی ہم سے متفق ہونگے، کسی راوی کے سچے یا جھوٹے ہونے کا یہ معیار نہیں، کہ اس نے کسی معجزہ کی روایت کی ہے یا نہیں کی ہے، کہ اس کے وقوع و عدم وقوع اور امکان اور عدم امکان میں ہم سب متفق نہیں ہیں،

اب میں آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں، کہ ابوہریرہؓ نے شق القمر کی روایت قطعاً نہیں کی ہے، اور نہ بخاری میں ان کی یہ روایت مذکور ہے، شق قمر کے راوی صحابہ میں عبداللہ بنؓ مسعود، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیر بن مطعمؓ، علی بنؓ ابی طالب اور حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ ہیں، ابوہریرہؓ اس واقعہ کے تقریباً آٹھ برس بعد مسلمان ہو کر اپنے وطن یمن سے مدینہ آئے ہیں، اس بارہ میں ان کا کوئی بیان بخاری میں قطعاً نہیں ہے، اور نہ کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے،

اس الزام کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ "امام زہری نے خود اقرار کیا ہے، کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں"، اور میں یہ کہنے کی ہمت نہیں پاتا، کہ انگلینڈ کی ایک بڑی یونیورسٹی کا عربی پروفیسر ایک معمولی عربی عبارت کے سمجھنے میں قصداً غلطی کرتا ہے، یا وہ اضطراراً غلطی پر مجبور ہے، خوش قسمتی سے اس نے وہ عبارت بھی نقل

کر دی ہے، جس کے معنی اس نے یہ سمجھے ہیں، کہ زہری نے خود اعتراف کیا ہے۔ کہ انھوں نے بادشاہوں کے دباؤ سے جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں، اصل عبارت یہ ہے: ۔

اکرھنا علیہ ھٰؤلاء الامراء	بادشاہوں نے ہم کو اس پر مجبور کیا،

اب فوراً سوال ہوتا ہے کہ کس امر پر مجبور کیا؟ اس کا مشارٌ الیہ اس منقولہ عبارت میں موجود نہیں۔ اس لئے جہاں سے یہ عبارت بالا نقل کی گئی ہے، وہیں سے اس کا بقیہ ٹکڑا بھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے،

عن عبد الرزاق عن معمر عن الزھری	عبد الرزاق معمر سے اور زہری سے روایت کرتے ہیں
قال کنا نکرہ کتاب العلم حتی	کہ زہری کہتے ہیں کہ ہم لوگ علم (حدیث) کو لکھنا ناپسند
اکرھنا علیہ ھٰؤلاء الامراء	کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو بادشاہوں (یعنی
فرأینا ان لا یمنعہ احد من	خلفائے بنو امیہ) نے اس کے لکھنے پر مجبور کیا، اور اب ہم
المسلمین، (ص ۱۳۵)	یہ سمجھتے ہیں، کہ کوئی مسلمان اب اس کو منع نہ کرے،

یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبد البر (ص ۳۶، مصر) تقیید العلم ابن جوزی اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے، اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے، کہ بعض علماء حدیث کے لکھنے سے منع کرتے تھے، اور وہ بشدت اس سے پرہیز کرتے تھے مگر سلاطین بنو امیہ نے فرمایش کر کے محدثین کو مجبور کر دیا کہ وہ احادیث کو اوراق میں لکھیں، اور ان کے تحریری مجموعے ترتیب دیں، اور آخر امام زہری کو بھی اس کی مصلحت معلوم ہوئی، اور انھوں نے اس کی تعمیل کی، چنانچہ ان کے ترتیب دئے ہوئے احادیث کے مجموعے ولید کے خزانہ سے اس کے قتل کے بعد برآمد ہوئے، (ابن سعد ۲ - ۱ - ۱۳۶) غور کیجئے! کہاں زہری کا یہ اقرار کہ "انھوں نے سلاطین کی فرمایش سے احادیث کے مجموعے مرتب کئے"! اور کہاں یہ اقرار کہ - "سلاطین کے مجبور کرنے سے انھوں نے حدیثیں وضع کیں اور گھڑ لیں"۔ اللہ اکبر!

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

فاضل پروفیسر کا یہ کہنا کہ "وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں، وہ ان سے جو اس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں"، تحقیق پر مبنی نہیں، بلکہ فقط واقدی کے ساتھ حسن ظن پر مبنی ہے، واقدی کے موافقین اور مخالفین دونوں میں اس کے ہم عصر اور اس کے بعد کے لوگ داخل ہیں، مزید ثبوت کے لئے ذیل میں دونوں کی ولادت

اور وفات کی تاریخیں لکھدی جاتی ہیں، چونکہ واقدی کے موافقین اس کے مخالفین کے مقابلہ میں کم درجہ کے لوگ ہیں، اس لئے ان میں اکثر کی ولادت کی تاریخیں کم از کم مجھ کو نہ مل سکیں،

۱۔ محمد بن عمر الواقدی

سنہ ۱۳۰ھ — سنہ ۲۰۷ھ

۱۔ موافقین واقدی،

نام	سال ولادت	سال وفات
۱۔ عبدالعزیز بن محمد دراوردی		سنہ ۱۸۶ھ
۲۔ یزید بن ہارون	سنہ ۱۱۷ھ (شاید)	سنہ ۲۰۶ھ
۳۔ ابوعبید قاسم بن سلام	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۲۴ھ
۴۔ مصعب بن عبداللہ الزبیری	سنہ ۱۵۶ھ	سنہ ۲۳۶ھ
۵۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر	۔	سنہ ۲۳۴ھ
۶۔ محمد بن اسحاق مسیبی	۔	سنہ ۲۳۶ھ
۷۔ عباس عنبری	۔	سنہ ۲۴۶ھ
۸۔ یعقوب بن شیبہ	۔	سنہ ۲۶۲ھ
۹۔ محمد بن اسحاق الصغانی	۔	سنہ ۲۷۰ھ
۱۰۔ ابراہیم الحربی	۔	سنہ ۲۸۰ھ

۲۔ مخالفین واقدی

نام	سال ولادت	سال وفات
۱۔ امام شافعی	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۰۴ھ
۲۔ یحییٰ بن معین	سنہ ۱۵۸ھ	سنہ ۲۳۳ھ
۳۔ احمد بن حنبل	سنہ ۱۶۰ھ	سنہ ۲۴۱ھ
۴۔ علی بن المدینی	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۴۱ھ

نام	سالِ ولادت	سالِ وفات
۵ ۔ اسحاق بن راہویہ	سنہ ۱۶۱ ھ	سنہ ۲۳۸ ھ
۶ ۔ محمد بن بشار بندار	سنہ ۱۶۷ ھ	سنہ ۲۵۲ ھ
۷ ۔ ابو حاتم رازی	سنہ ۱۹۵ ھ	سنہ ۲۷۷ ھ
۸ ۔ امام بخاری	سنہ ۱۹۴ ھ	سنہ ۲۵۶ ھ
۹ ۔ جوزجانی (ابراہیم بن یعقوب)	•	سنہ ۲۵۶ ھ
۱۰ ۔ ابوزرعہ رازی	سنہ ۲۰۰ ھ	سنہ ۲۶۴ ھ
۱۱ ۔ ابو داؤد سجستانی	سنہ ۲۰۲ ھ	سنہ ۲۷۵ ھ
۱۲ ۔ امام نسائی	سنہ ۲۱۵	سنہ ۳۰۳ ھ
۱۳ ۔ ابو بشر دولابی	سنہ ۲۲۴ ھ	سنہ ۳۱۰ ھ
۱۴ ۔ ابن عدی	سنہ ۲۷۷	سنہ ۳۶۵
۱۵ ۔ دارقطنی	سنہ ۳۰۶ ھ	سنہ ۳۸۵

امام بخاری کی وفات کا واقدی کی وفات کے پچاس برس بعد واقع ہونا، ان دونوں کی معاصرت کی نفی کی کوئی دلیل نہیں، معاصرت کا حساب دونوں کی زندگیوں کے کم و بیش ایک ساتھ ہونے سے لگایا جاتا ہے، نہ موت سے، واقدی نے سنہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی، اور امام بخاری سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، اس لئے وہ اس وقت چودہ برس کے طالب العلم تھے، اور واقدی کے ذاتی طور سے ملنے والے اور جاننے والے تمام درسگاہوں میں موجود تھے، امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا یہی مطلب ہے، انھوں نے واقدی کے متعلق لکھا ہے۔ (ص ۲۲۸، الہ آباد) ترکوہ یعنی لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے، کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو امام بخاری سے پہلے کے تھے، یا ان کے زمانہ میں تھے، پہلی صورت میں یہ چھوڑنے والے خود واقدی کے معاصرین ہوں گے، اور دوسری صورت میں کچھ معاصر ہوں گے، اور کچھ معاصرین سے سننے والے ہوں گے، اس سے ثابت ہوا کہ بخاری کے مرنے سے واقدی کا پچاس برس پہلے مرجانا، بخاری کی واقدی سے عدم واقفیت کی دلیل نہیں ہو سکتی، خصوصاً جب کہ یہ معلوم ہوگا کہ وہ بچپن سے تحصیل علم میں مصروف

ہو گئے تھے۔ اور واقدی کی وفات کے دو برس بعد ہی وہ عرب جانے کے لئے عراق پہونچ چکے تھے۔

بہر حال موافقین کی ولادت کی تاریخیں چونکہ کمتر معلوم ہیں، اس لئے واقدی المتولد ۱۳۰ھ المتوفی ۲۰۷ھ کے معاصرین کا حال پورے یقین سے نہیں معلوم ہو سکتا تاہم مخالفین کی تاریخوں کی نظیر سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۵۱ھ تک جس نے وفات پائی ہے، اس نے واقدی کا زمانہ پایا ہے۔ اس لحاظ سے موافقین میں سے نمبر ۲ تک یعنی عباس عنبری تک اس کے معاصرین میں ہیں، اور تین متاخرین ہیں،

مخالفین میں امام شافعی المتولد ۱۵۰ھ یحییٰ بن معین المتولد ۱۵۸ھ۔ احمد بن حنبل المتولد ۱۶۰ھ علی بن المدینی المتولد ۱۶۱ھ۔ اسحاق بن راہویہ المتولد ۱۶۱ھ۔ بندار المتولد ۱۶۷ھ چھ ایسے جلیل القدر ائمہ فن ہیں جو اس کے ہمعصر ہیں اور اس کا زمانہ پایا ہے، اور کم از کم ستاون برس سے ۴۰ برس تک اس سے ان کی معاصرت قائم رہی ہے، واقدی کی وفات کے وقت امام بخاری کی عمر چودہ برس کی تھی۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا۔ ابو حاتم رازی کی عمر اس وقت تیرہ برس، اور ابو زرعہ رازی کی عمر آٹھ برس تھی۔ اور اس وقت واقدی کا چرچا درس کے ان حلقوں میں کافی موجود ہوگا جن میں جا کر وہ بیٹھے۔ بقیہ اشخاص کی رائیں ذاتی تجربہ پر نہیں۔ بلکہ واقدی کے مجموعوں اور اپنے ان شیوخ کی آراء پر مبنی ہیں، جنہوں نے واقدی کو خود دیکھا تھا، یا واقدی کے دیکھنے والوں کو دیکھا تھا۔ البتہ ابو بشر دولابی، ابن عدی۔ اور دارقطنی کی رائیں اس کے متعلق اس کے معاصر جمہور علماء، اور بعد کے اکابر کے اختتامی فیصلہ پر مبنی ہیں، اس لئے واقدی کے معاملہ میں یہ اصول صحیح ہوگا۔ کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں تو یہ مشکل مناسب ہوگا، کہ بعد کی نسل کے تھیالوجینس کی بلا دلیل رایوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہہ کر بدنام کیا جائے۔

واقدی کے مخالفین اور موافقین کی ترجیحی ترازو کا فیصلہ دو اور پاسنگ سے بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ان کے فضل و کمال، جمہور اہل عصر میں ان کے اعتبار و استناد اور ان کی شہرت اور عزت کی بنا پر۔ چنانچہ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ کہ بحیثیت ایک سچے طالب العلم اسلام کے ان دو جماعتوں میں سے آپ سب سے زیادہ کس سے واقف ہیں۔ اور اسلامی لٹریچر میں کس کے نام کو اہمیت، اور کس کی رائے کو وقعت حاصل ہے۔ امام شافعی، امام بخاری، علی بن مدینی، ابن حنبل، ابن معین اور ابن راہویہ کو یا دراوردی، زبیری، مسیبی، یزید بن ہارون اور عنبری کو۔

دوسرا ترجیحی معیار یہ ہے کہ واقدی کا ابتدائی زمانہ گو مدینہ میں گذرا، لیکن اس کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں

بسر ہوا۔ ادروہیں اس کو شہرت حاصل ہوئی، اس بنا پر ان ائمہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہے، جو بغداد اور عراق میں عموماً سکونت رکھتے تھے، یا اکثر آتے جاتے تھے، اس حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کا یہ حال ہے کہ دراوردی مدینہ میں رہے، ۱۸۶ھ میں وفات پائی، اور بغداد نہ آئے۔ واقدی میں جو خاص انقلاب ہوا، اور جو ان کی موت سے کم از کم ۲۲ برس بعد تک رہا، اس کی واقفیت سے وہ قطعاً محروم رہے، اس لئے ان کی رائے واقدی کی صرف مدنی زندگی تک محدود ہے، بقیہ میں ایک زبیری البتہ بغداد میں رہتے تھے، ابن نمیر کوفہ میں اور یزید بن ہارون واسط میں رہتے تھے، مگر مخالفین کو دیکھو کہ ان میں بیشتر اصحاب یا بغداد ہی میں رہتے تھے یا بہت دنوں تک مدینہ اور بغداد دونوں میں رہے تھے، چنانچہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین خاص بغداد کے تھے، علی بن مدینی مدینہ اور بصرہ میں تھے، بندار بصرہ اور بغداد میں سکونت رکھتے تھے، اسحاق بن راہویہ عراق ہی میں سکونت پذیر تھے، امام شافعی مدینہ میں رہے اور بغداد بھی آتے رہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

(معارف جنوری ۱۹۲۷ء)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں

بنگال سنتے ہیں کہ مسلمانوں کا صوبہ ہے۔ مگر وہاں کی تعلیم گاہوں سے وقتاً فوقتاً مسلمان اور تاریخ اسلام کے متعلق ایسی ہنگامہ خیز اطلاعیں آتی ہیں کہ ہم کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی بنگال میں مسلمانوں کی کوئی قوت ہے بھی یا نہیں،

ابھی اکبر کی دین الٰہی والی کتاب کا ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا، کہ معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ایک مشنری کالج (سینٹ زیویر کالج) کے ہائی اسکول سکشن میں ایک کتاب "کیتھولک چرچ ہسٹری" طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے، جس میں ایک باب اسلام کے تحت خلاف ہے، کتاب مذکور کے اس باب کا خلاصہ میں نے پڑھا تعجب ہوا، کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے، جو مذہبی رواداری ہی کے خلاف نہیں، بلکہ علم اور دانشمندیت کے بھی خلاف ہے، عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا ہے کہ انھوں نے تلوار کے زور سے اپنے مذہب کو پھیلایا ہے، یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط۔ مگر بہر حال انھوں نے جھوٹ اور فریب سے اپنے مذہب کو کبھی نہ پھیلایا، جیسا کہ اس زمانہ کی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں میں نظر آتا ہے، اس کتاب کے اس باب کا حاصل بھی یہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا ہے، ممکن ہے بعض صورتوں میں یہ واقعہ صحیح ہو، جس طرح جرمنی کے باب میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہاں عیسائیت تلوار کی نوک سے پھیلائی گئی ہے،

اس باب میں پیغمبر اسلام علیہ السلام اور خلفاء کے بھی مختصر واقعات ہیں،

دنیا اس کتاب کے مصنف کی اس تحقیق کو سن کر حیران رہ جائے گی، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ یہودیہ تھیں، حضرت آمنہ بنت وہب کو جو قریش کی سیدہ تھیں، یہودی نسل یا مذہب سے بتانا ایک ایسا جھوٹ ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

۲۔ اس کتاب کا یہ بیان کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے چھبیس سال میں نبوت کا دعویٰ کیا،

مشرکی جہالت کا آئینہ ہے، دنیا جانتی ہے، کہ حضور کی نبوت اس کے دس برس بعد کا واقعہ ہے، جب عمر شریف چالیس سال کی تھی اور شباب کا عہد اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

۳۔ آپ کی ولادت کا سال ۵۸۰ء بتا کر ہجرت کا سال ۶۲۲ء بتانا بھی تاریخ کا خون کرنا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کا واقعہ آپ کی عمر کے بیالیسویں سال پیش آیا، حالانکہ آپ کی عمر اس واقعہ کے وقت باتفاق عام ترپن سال تھی، کیونکہ چالیسویں سال آپ کو نبوت ملی، اور اس کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہ کر، قریش کے ہر قسم کے ظلم وستم سہے۔ تب مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ اور اس کتاب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ نبوت ملنے کے بعد جب بت پرستی کے خلاف آپ نے وعظ شروع کیا، تو بت پرست قریشیوں کے غیظ وغضب کو دیکھ کر آپ فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ چل دیئے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

۴۔ مصنف کا یہ بیان بھی تحقیق سے خالی ہے، کہ قرآن پاک، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع کیا گیا کوئی کتاب جس کی سطریں یکجا اور آیات مرتب نہ ہوں، نہ پڑھنے میں آسکتی ہے، اور نہ اس کی تلاوت کی جاسکتی ہے، حالانکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ قرآن پاک کا ہر حصہ اس وقت بھی ہر مسلمان نماز میں پڑھتا تھا، اور ہر روز اس کی تلاوت کرتا تھا، ہاں یہ صحیح ہے کہ کاغذ پر اس کی تمام آیتیں اور سورتیں یکجا ترتیب کے ساتھ بشکل کتاب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں لکھی گئیں۔

۵۔ اس کتاب کا بیان ہے کہ جب آپ سے درخواست کی جاتی تھی، کہ آپ کوئی مافوق الفطرۃ نشانات اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کریں، تو آپ جواب دیتے کہ "مجھے اللہ تعالیٰ نے معجزات دکھانے کے لئے نہیں بھیجا ہے، بلکہ دعوت دینے اور لڑنے کے لئے بھیجا ہے"۔ اس بیان کی صداقت کے لئے مصنف نے قرآن کی سورہ ۱۳، آیۃ ۱۷ کا حوالہ دیا ہے، میرا چیلنج ہے کہ اس معنی کی کوئی آیت قرآن پاک میں نہیں ہے، قرآن کی تیرہویں سورہ رعد ہے، اور اس کی جس تیرہویں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ شاید حسب ذیل ہے۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ	اور کافر کہتے ہیں، کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف
عَلَیْہِ اٰیَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ اِنَّمَآ	سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری (اے محمد) آپ تو

لے ولادت کی صحیح تاریخ اپریل ۵۷۱ء ہے، ہجرت کی ستمبر ۶۲۲ء ہے۔ "س"

اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۔ — خبردار کرنے والے ہیں، اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما ہے۔

اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں، جو معجزہ دکھانے کے واقعہ کو ظاہر کرے اور یہ کہے کہ "آپ" "لڑنے" کو بھیجے گئے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن پاک کے کسی ترجمہ میں منذر کا خبردار اور ہشیار کرنے والے کے بجائے ڈرانے والا یا ڈر سنانے والا کیا گیا ہے۔ اور اس سے لڑنے کا مفہوم حاصل کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ منذر عربی زبان میں وقت سے پہلے آنے والی مصیبت کو بیان کر کے اس سے بچنے کی تدبیر کے لئے تیار کرنے والے کو کہتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر کسی مریض کو دیکھ کر آئندہ خطرات سے اس کو ہشیار اور تنبیہ کرے، کہ اگر اپنی حالت کی درستی کے لئے کوشش نہ کروگے، تو تم کو فلاں فلاں بیماریاں لاحق ہو جائیں گی۔ اس انداز کو جنگ اور لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تنبیہ اس عذاب الٰہی کے مقابلہ میں ہے، جو دوسری دنیا میں اسلام کے پیغام کے نہ ماننے اور اس پر عمل نہ کرنے سے پیش آنے والا ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے، اور ان ہی معنوں میں آیا ہے، جیسے سورۂ زمر میں ہے، فرشتے قیامت میں کہیں گے۔

اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ رَبِّکُمْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ۔ (زمر۔ ۸)	کیا تمہارے پاس تمہارے میں سے رسول تم کو تمہارے پروردگار کے حکم کو پڑھ کر سنانے اور اس تمہارے دن کی ملاقات سے ڈرانے والے اور ہشیار کرنے نہیں آئے

کیا قیامت کا میدان لڑائی کا میدان ہے۔ دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰهَا ۔ (نازعات۔ ۲)	آپ اس کو ڈر سنانے والے ہیں، جو قیامت سے ڈرتا رہے۔

دیکھئے اس میں ٹھیک وہی لفظ منذر ہے، جو پہلی آیت میں ہے۔

سورۂ یٰسین میں ہے۔

وَسَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اِنَّمَا تُنْذِرُ	اور برابر ہے ان کے لئے ان کو ہشیار کریا نہ کر وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ تم اسی کو ہشیار کر سکتے ہو۔

مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۔

(یٰسین - ۱۱)

جو نصیحت کی پیروی کرتا اور بن دیکھے رحمت والے خدا سے ڈرتا ہے، تو اس کو گناہوں کی معافی اور نیک مزدوری کی خوشخبری سنا دے۔

کیا یہ انذار والا اعلانِ جنگ ہے، اور کیا اسی کو اعلانِ جنگ ہے، جو نصیحت کو مانتا ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔
یہ کیسا احمقانہ انداز ہے۔

قرآن کہتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ

(فاطر - ۲۴)

اور (دنیا کی) کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ایک ڈر سنانے والا نہیں آیا۔

کیا ہر قوم میں آنے والا اور ہشیار کرنے والا پیغمبر، جو قوموں کو ان کے اعمالِ بد کی پاداش سے ہشیار اور باخبر کر کے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرتا ہے، یا وہ جنگ کا الٹی میٹم دینے والا ہوتا ہے، ایک اور آیت ہے۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ۔

(نازعات - ۴۵)

اے پیغمبر! تم اس کو جو قیامت سے ڈرتا ہو ہشیار کرنے والے ہو۔

یہاں صاف تصریح ہے کہ عربی میں لفظ انذار کا مفہوم ہشیار و باخبر کرنا اور عملِ بد کی پاداش سے متنبہ کرنا ہے، نہ کہ لڑائی اور جنگ جوئی۔

اب یہ کہنا ہے کہ اس آیت میں بے شبہ عجائب و غرائب اور خوارقِ عادت کے مانگنے والے کو خوارق اور معجزات کے بجائے اسلام کی تعلیم و ہدایت کی صداقت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور عجائب پرستی کے عامیانہ جذبے کے بجائے عقل و خرد کو کام میں لانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ مگر اس سے اس کا انکار نہیں نکلتا، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ معجزات دکھانے سے انکار کیا ہے، قرآن خود معجزہ ہے، اور اس میں متعدد معجزوں کا بیان مذکور ہے جن میں ایک شق القمر کا معجزہ بھی ہے، جو سورۂ قمر میں ہے، اسی طرح بدر اور خندق کے معجزوں اور روم کی فتح کی پیشین گوئی کا ذکر بھی ہے۔

اس آیت میں معجزوں کے دکھانے سے جو پہلو تہی ظاہر کی گئی ہے، اس کے وہی معنی ہیں، جو حضرت مسیح علیہ السلام

کے اُن فقروں کے ہیں، جن میں معجزوں کے دکھانے سے انھوں نے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ "اس قوم کو یونسؑ کے معجزہ کے سوا اب کوئی اور معجزہ نہیں دکھایا جائے گا۔ (تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں اس کو پڑھیں۔)

اتفاق سے[1] انجیل کا ایک نسخہ اس وقت مل گیا ہے، اس سے یہ دو درس بالفعل نقل کر دیئے جاتے ہیں۔

" اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں، اس نے جواب دے کر ان سے کہا، اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان چاہتے ہیں، مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔

(متی ۱۲۔ ۴۰)

مرقس میں ہے: ۔

پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے، اور (آسمانی) آزمانے کے لئے اس سے کوئی نشانی طلب کیا، اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا، اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا، اور وہ ان کو چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھ گیا، (۸۔ ۱۱)

اس انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں سے بھری ہوئی ہے، آزمایشی اور فرمایشی معجزوں کے جواب میں انکار کا ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے تائیدی معجزے گو بکثرت ہوتے ہیں، مگر تحدی یہ معجزہ کے دکھانے سے وہ انکار کرتے ہیں، کہ قانونِ الٰہی کے مطابق ایسے معجزوں کے ظہور کے بعد نافرمان امت کی ہلاکت یقینی ہے، اس لئے وقت مقررہ سے پہلے یہ فرمایش پوری نہیں کی جا سکتی" ٹال دی جاتی ہے، کیا عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس انکار کی توجیہ اس سے بہتر کر سکتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں آخرت کو صرف مادی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور اس کے روحانی تخیل سے خالی ہے، یہ بھی معترض کی بے خبری ہے، اول تو یہ غرض ہے، کہ کیا انجیل میں قیامت کے بعد جنت میں اپنے ساتھیوں کے پہلو میں افشردۂ انگور خواہ وہ شربت ہو، یا شراب، پینے کا ذکر نہیں، (متی ۲۶۔ ۲۹)

اور کیا "دوزخ کی آگ" کا منظر انجیل میں جا بجا نہیں دکھایا گیا ہے، (لوقا ۱۲۔ ۵ و ۱۶ ۲۳۔ متی ۲۳۔ ۳۳)

---

[1] یہ مضمون بحالت سفر لکھا گیا۔

تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ نبوی کی چوتھی جلد میں دوزخ اور جنت کا بیان پڑھیں، اس میں بائبل کے اکثر حوالے لکھے ہیں، جن کو روشن خیال عیسائی چھپاتے ہیں، جہنم کے عذاب کا ذکر، (متی ۲۲ - ۴۲) میں ہے۔

فریسی یہودی جو قیامت کو مانتے تھے، وہ جنت و دوزخ کو سراسر مادی اور عیسائی اس کو سراسر روحانی فرشتوں کی سی زندگی بتاتے ہیں اسلام میں جنت و دوزخ کے تصور میں مادی و روحانی دونوں منظروں کی جامعیت ہے۔ بہشت باغ و بہار بھی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اور دیدار کے روح پرور جمال کا نظارہ گاہ بھی، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَر.   اور اللہ کی خوشنودی آخرت کی سب نعمتوں سے

(توبہ - ۹)   بڑھ کر ہے۔

(تفصیل میری مذکورہ بالا کتاب کی چوتھی جلد میں ہے۔)

زیر اعتراض باب کا آخری حصہ اس بیان میں ہے، کہ اسلام کی اشاعت صرف تلوار کے زور سے ہوئی ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے، انہی معنوں میں جن معنوں میں آج بھی عیسائی یورپ، اپنی عیسائی تہذیب کی اشاعت توپ و تفنگ اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کے ذریعہ سے کر رہا ہے، جس کے زیر سایہ عیسائی سامان عیش و مسرت اور مشنری صلح پسندوں کا غول ملکوں میں داخل ہوتا ہے، اور ان پڑھ جنگلیوں کو بے خبری کی حالت میں عیسائی بناتا ہے، افریقہ کے نگرو اگر عیسائیت کے بجائے اسلام کو قبول کرتے ہیں، تو اس سے ہمارے عیسائی دوستوں کو فکرمند ہونے کی کیا بات ہے،

اسلام کی تلوار ابی سینیا میں کبھی نہیں چمکی، پھر وہاں مسلمانوں کی تعداد کہاں سے آئی، جزائر ملایا و سیام میں کبھی اسلام نے کوئی لشکر نہیں بھیجا، پھر یہ کروڑوں مسلمان ان جزیروں میں کہاں سے آباد ہو گئے، فلپائن اور مدگاسکر وغیرہ جزیروں میں اسلام کس کشورکشا جلاد کے خوف کا نتیجہ ہے، چین میں مسلمانوں کی حکومت کبھی نہیں ہوئی، پھر وہاں کروڑوں مسلمان کس تلوار کے زور سے مسلمان بنائے گئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد اُن کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی تین چار کروڑ سے زیادہ نہ تھی، جیسا کہ پہلی مردم شماری میں درج ہے، مگر سو برس کے عرصہ میں ان کا بے تلوار کے دس کروڑ کے قریب ہوجانا کس مادی ہیبت کا نتیجہ ہے، پھر آج یورپ کے مختلف

ملکوں اور گوشوں میں اسلام کی نمود اری جب کہ اس کی ہر تلوار زنگ آلود ہو چکی ہے. کس اعجاز کا کرشمہ ہے افریقہ کے ریگستان کے ہر ٹکڑے میں آج عیسائیت تلوار کے زور سے قائم ہے تاہم روحانی مفتوحوں کی بڑی تعداد عیسائیت کے بجائے اسلام کے آغوش میں آتی ہے، کیونکہ اسلام افریقہ کو ایمان کی تازگی کے ساتھ حکومت کی آزادی بھی بخشتا ہے، لیکن عیسائیت تثلیث کی بت پرستی کے ساتھ یورپ کا غلام بناتی ہے،

رومن کیتھولک چرچ کی تاریخ میں یہ بھی لکھا تھا، کہ رومن کیتھولک چرچ انسانوں کو پوپوں کا معتقد بنایا کرتا تھا، اسلام نے آکر انسانوں کو صرف ایک خدا کا معتقد بنایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہودیوں نے حضرت مریم صدیقہ پر جو اخلاقی تہمت اور حضرت عیسٰی علیہ السلام پر جو الزامات لگائے تھے، اسلام ہی ہے جس نے ان معصوموں کی عصمت کی گواہی دے کر، کروڑوں بندگانِ خدا کے دلوں میں ان کی سچائی اور صداقت کا سکہ بٹھایا، اور عیسائیوں نے ان کو انسانوں کے بجائے جو دیوتا کی شکل عطا کی تھی، اس کو مٹا کر مقدس انسانوں اور محبوب بندگانِ الٰہی کی صورت میں جلوہ گر کیا۔

مصنف کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تیغ زن سپاہیوں سے بڑی شکایت ہے، لیکن کارلائل کی زبان میں اس سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان تیغ زن سپاہیوں کو تن تنہا کس تلوار کے زور نے مسلمان بنایا، ایسے تیغ زن سپاہیوں اور بہادروں کو جن میں سے کسی نے ایران کا تخت الٹ دیا، کسی نے قیصر سے مصر و شام اور شمالی افریقہ کا سارا علاقہ چھین لیا، اور کسی نے خراسان و ترکستان کی سرزمینوں کو روند ڈالا،

مشنریوں نے اسلام کے خلاف جو یہ خیال پھیلا رکھا ہے، کہ وہ کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ وہ صرف عیسوی اور یہودی مذہب کا مجموعہ ہے، کوئی نیا اعتراض نہیں، یہ تو پیغمبر اسلام کے عہد میں بھی کفار نے کہا تھا،

لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے، کہ بجائے خود اسلام کا دعویٰ بھی یہی ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک جو کچھ انبیا علیہم السلام سے کہا گیا تھا، اور جس کو ان کے پیرؤوں نے بھلا دیا تھا، اسلام کے ذریعہ سے وہی پیغام پھر دنیا میں بھیجا گیا جس طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اپنے معترضوں سے یہ کہا تھا کہ میں توراۃ کے قانون کو مٹانے کے لئے نہیں، بلکہ اس کو پورا کرنے کے لئے آیا ہوں، اور جب تک دنیا قائم ہے، توراۃ کا ایک نقطہ نہیں گیا، اسی طرح قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ توراۃ اور انجیل کا مصدق ہے،

مصدقًا لما بین یدیہ، (بقرہ - ۱۲) اگلی کتابوں کو سچا بتانے والا۔

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ دین الٰہی ایک ہی ہے، جو آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یکساں پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا جاتا رہا، اور قرآن پاک میں جو کچھ ہے وہی اگلی کتابوں میں بھی تھا، چنانچہ وہ اپنی نسبت آپ گواہی دیتا ہے، توراۃ اور انجیل کے ذکر کے بعد ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ (مائدہ - ۷)

اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اور ان کتابوں پر مہیمن ہے

لفظ مہیمن کا ترجمہ محافظ، مشتمل اور جامع بھی کیا گیا ہے،

سورہ شعرا میں ہے :۔

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ،

اور یہ مضمون (جو قرآن میں ہے) اگلوں کی کتابوں میں (بھی) ہے،

ایک سورہ میں ہے :۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی، (اعلیٰ - ۲)

یہ مضمون اگلے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں۔

سورہ شوریٰ میں ہے :۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی، (شوریٰ - ۲)

اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا، اور جس کو ہم نے تمہارے پاس وحی کیا، اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا،

اب جس بات کا قرآن خود دعویٰ کر رہا ہو، اور جو اس کے منفرد اور متعدد صداقت کی دلیل ہے، اس کو اعتراض کے موقع پر پیش کرنا کہاں تک صحیح ہے، اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ تمام انبیاءؑ ایک ہی دعوت، ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت لے کر آئے، مگر ان کے متبعوں نے اس کو کھو دیا، اور بگاڑ دیا، اب وہی چیز قرآن کے قالب میں آخری بار آئی ہے، اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے: "وانا لہ لحافظون"۔

اب جہاں تک عقائد حقہ تعلیمات صحیحہ اور انبیا کے صحیح واقعات وقصص کا تعلق ہے، قرآن پاک اور توراۃ اور انجیل کی یکسانی بالکل کھلی بات ہے لیکن جہاں ان کتابوں کی تحریفات اور انسانی آمیزشوں کا تعلق ہے قرآن سب سے الگ اور ان سب میں ممتاز ہے، تثلیث کا عقیدہ اور ان عقائد کے ذکر سے جن کو پالوس نے دین عیسوی میں شامل کیا ہے، قرآن پاک بری ہے، اسی طرح انبیا علیہم السلام کے قصوں کے ان عناصر کی جو توراۃ میں بری طرح آج مذکور ہیں. قرآن نے علانیہ تردید کی ہے، اور انبیا علیہم السلام کی عصمت کو دنیا میں دوبارہ ظاہر کیا ہے، اگر قرآن پاک موجودہ انجیل اور موجودہ توراۃ کا مجموعہ ہوتا، تو یہ امتیاز کیوں نظر آتا،

مقصود یہ ہے کہ خدا، انبیا، قیامت، جزا وسزا اور قصص انبیا کی حد تک قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کا اتحاد، قرآن پاک کی صداقت کی دلیل ہے، نہ کہ بطلان کی، کہ یہ سب چشمے ایک ہی ربانی سرچشمہ سے نکلتے ہیں،

اور اگر مقصود یہ ہے کہ اگلی کتابوں کی کوئی بات پچھلی کتاب میں دہرائی نہ جائے، تو اس نقص سے عیسائیوں کی موجودہ انجیل بھی خالی نہیں، وہ بھی یہودی کتب اسفار کے اقوال کی تکرار سے معمور ہے، حضرت عیسیٰ کا آخری فقرہ ایلی ایلی لما سبقتنی، (مرقس ۱۵-۳۴، متی ۲۷-۴۶) زبور ۲۲ میں مذکور ہے، اور حضرت داؤد کی دعا کا ٹکڑا ہے، خدا کے باپ اور حضرت عیسیٰؑ کے بیٹے ہونے کا دعویٰ بھی زبور ۲-۷ کی نقل ہے، جس میں حضرت داؤد نے خدا کو مجازاً باپ اور اپنے کو بیٹا کہا ہے، انجیل کی بہت سی خوبصورت تمثیلیں بھی عہد قدیم کے صحیفوں میں ملتی ہیں، اور ان کے علاوہ مصری اور یونانی بیفتا لوجی بلکہ بودھ تک کے فقرے بھی موجودہ انجیل کے نسخوں میں مذکور ہیں، مصر کے ایک فاضل نے التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والدیانۃ المسیحیہ میں ان سب کو پوری تفصیل سے جمع کر دیا ہے،

(معارف ماہ اگست ۱۹۴۵ء)

اساطیرُ الاوّلین

یورپ جس طرح علم کا مخزن ہے، وہ جہل کا بھی مرکز ہے، جس ذرہ سے اس کو اپنے ادعا میں کچھ بھی فائدہ کی توقع ہوتی ہے، اس کو وہ پتھر کی چٹان نظر آتا ہے، اور جس پتھر کی چٹان سے اس کے شیشۂ ادعا کو ذرہ بھی ٹھیس لگنے کا خطرہ ہوتا ہے، وہ اس کو ذرہ سے بھی کم نظر آتا ہے، اس کے نزدیک صحتِ واقعہ کا معیار دلائل کا ضعف و قوت نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی تسلیم و انکار سے اس پر یا اس کے حریف پر کیا فوائد اور نقصانات مرتب ہوں گے،

سر ولیم میور کو ینابیع القرآن (سورسز آف قرآن) کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس ثبوت سے ایک خوشی محسوس ہوتی ہے، کہ "قرآن مختلف ادیان و مذاہب کے خیالات و اعتقادات کا مجموعہ ہے" لیکن اس واقعہ کو اگر ہم یوں دہراتے ہیں، کہ اوقاتِ مختلفہ میں دنیا کے ہر گوشہ میں خدا کا ایک منادی اور داعی آیا، وَاِنْ مِنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ. اور قرآن ان تمام منادیوں اور دعوتوں کا مجموعہ ہے، وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ، تو ہم دفعتہً دیکھتے ہیں کہ یورپین نصرانی کا سرخ و سپید چہرہ زرد پڑ جاتا ہے کہ کہیں اس چٹان سے اس کے نازک شیشۂ اعتقاد کو ٹھیس نہ لگ جائے.

مشہور مورّخ گبن نے ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمدؐ کا مذہب شک و شبہہ سے پاک ہے. اور قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک شاندار شہادت ہے، پیغمبر مکہ نے بتوں کی، آدمیوں کی، ستاروں کی، اور سیاروں کی پرستش اس دلیل سے رد کر دی، کہ جو طلوع ہوگا. وہ غروب ہوگا. اور جو پیدا ہوگا وہ مرے گا. اور جو حادث

ہوگا، وہ فانی ہوگا ..... عقل کے اصولِ اوّل یعنی توحید کی تائید میں محمدؐ کی آواز بلند ہوئی اور اس کے پیرو مراکش سے ہندوستان تک موحدین کے لقب سے ممتاز ہیں، اور بت پرستی کا خوف اب محمدؐ کے پیرووں سے بالکل دور ہے۔[۱۵] (خلاصہ)

ہمارے ایک نصرانی دوست اولیفنٹ سمیٹن ایم، اے (oliphant Smeaton M.A.) جنہوں نے تاریخِ زوالِ روم کی تصحیح و تحشیہ کی تکلیف اٹھائی ہے، حقیقت و صداقت کے اس چٹان کو دیکھ کر کانپ اٹھے، اور چاہا کہ اس اساس محکم اور بنیادِ غیر متزلزل کو آلاتِ جہل و افترا سے منہدم کردیں، وَاَنّٰی لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ۔

ہمارا یورپین نصرانی محقق گبن کے ان منصفانہ الفاظ سے بے تاب ہوکر اس موقع پر حسبِ ذیل حاشیہ لکھتا ہے:

"گبن کا بیان محمد (صلعم) کے نظامِ مذہب اور اس کی جدت کی نسبت نہایت مہربانہ ہے حالانکہ محمد (صلعم) نے تو سادگی سے ایک نظام میں ان امور کو جمع کردیا، جو اس کے چاروں طرف دماغوں میں پھیلے ہوئے تھے، قریش خود محمد (صلعم) کو الزام دیتے تھے، کہ ان کی تمام تعلیمات ایک کتاب سے ماخوذ ہیں، جس کا نام "اساطیر الاولین" ہے، جس کا چند مقامات میں قرآن میں بھی ذکر آیا ہے اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشر ونشر کے واقعات پر مشتمل ہے"

اس غریب نصرانی کو کیا معلوم کہ اس کے قلم سے جو حرف نکل رہا ہے، وہ جہل و نامعلومی کا ایک دفتر ہے،

قرآن میں بے شک لفظ "اساطیر الاولین" متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن تم کو کس نے بتایا کہ یہ ایک کتاب کا نام ہے؟ اگر یہ استدلال صحیح ہے، کہ قرآن میں کسی لفظ کا متعدد بار استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی قدیم کتاب کا نام ہے۔ تو خود لفظ اسلام، رسول اللہ اور صلوٰۃ کو کسی قدیم کتاب کا نام کیوں نہیں قرار دیتے، کہ لفظ اساطیر سے زیادہ تو یہ الفاظ قرآن میں بار بار آئے ہیں،

---

[۱۵] تاریخ زوالِ روم جلد ۵ ص ۲۳۷

اساطیر الاولین کی لفظی تشریح

"اساطیر الاولین" دو لفظوں سے مرکب ہے، اساطیر اور اولین، اساطیر، اسطور کی جمع ہے، جس کے معنی داستان اور قصہ کے ہیں، اولین، اول کی جمع ہے جس کے معنی گذشتہ پہلے اور اگلے کے ہیں، دونوں لفظوں کے مرکب معنی ہیں، اگلوں کے قصے، پہلوں کی کہانیاں، گذشتہ اقوام و اشخاص کی داستانیں،

قال الراغب ماسطر الاولون فی الکتاب من القصص والاحادیث قال الجوھری الاساطیر الاباطیل الترھات قال السدی اساجیع اولین، قال ابن عباس احادیث الاولین وقال قتادہ کذب الاولین وباطلھم،

امام راغب اصفہانی اساطیر کے معنی لکھتے ہیں، پہلوں نے کتابوں میں جو قصے کہانیاں لکھیں امام لغت جوہری کہتا ہے، اساطیر کے معنی "بیہودہ اور خرافات باتیں" سدی کہتا ہے کہ اس کے معنی "اگلوں کی کی قوافی" ہیں، ابن عباس رضی فرماتے ہیں "اگلوں کی باتیں" اور قتادہ رضی کہتے ہیں کہ "اگلوں کے جھوٹ اور کذب" اس کے معنی ہیں،

اور تعجب ہے کہ اسطور جو اساطیر کا واحد ہے کوئی ایسا لفظ نہیں، جس سے ایک یورپین محقق ناآشنا ہو. کیا اس نے اسی لفظ کو انہی معانی کے ساتھ لاطینی اور جرمن میں ہسٹوری (History) اور انگریزی میں ہسٹری اور اسٹوری (story) کی صورت میں نہیں پڑھا ہے، اور اگر پڑھا ہے اور یقیناً پڑھا ہے، تو کیا تعصب و عداوت ہے کہ قرآن کے اس لفظ کو اس معنی میں نہیں لیتے،

اساطیر الاولین کی معنوی تشریح

انسان کی فطرت یہ ہے، کہ واقعات ماضیہ کی تاریخ، اقوام فانیہ کی سرگذشت اور اشخاص گذشتہ کی داستان زندگی سے نہایت دلچسپی لیتا ہے، اور اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ دنیا میں جس کثرت سے تاریخ اقوام اور سرگذشت اشخاص کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں، کسی دوسرے علم و فن کی کتابیں نہیں پڑھی جاتی ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں بغرض اعتبار واستبصار نہایت کثرت سے اقوام ماضیہ کے اخبار تاریخی، اشخاص گذشتہ کے واقعات زندگی اور ممالک فانیہ

کے حالات بقا و فنا بیان ہوئے ہیں، کفار و ملحدین جو چشمِ بصیرت اور گوشِ اعتبار سے محروم تھے، کہتے تھے کہ قرآن میں قصص پارینہ اور افسانہائے کہنہ کے سوا اور کیا دھرا ہے؟ قیامت، معاد، اور حالاتِ ماورائے مادہ کو بعید از عقل سمجھ کر ان کو "داستانِ کہن" کے نام سے تعبیر کرتے تھے، چنانچہ بہ ترتیب قرآن سب سے پہلی آیت جس میں "اساطیر الاولین" کا لفظ ہے، سورۂ انعام کی آیت ہے، جس کی شانِ نزول میں مذکور ہے،

قال ابن عباس حضر عند رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ابو سفیان والولید بن المغیرة والنضر ابن الحارث وعقبہ وعتبہ وشیبہ وابناء ربیعہ وامیہ وابی ابناء خلف والحارث بن عامر واستمعوا الی حدیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا للنضر ما یقول محمد فقال لا ادری ما یقول مکنی اراہ یحرك شفتیہ ویتکلم باساطیر الاولین کالذی کنت احدثکم بہ عن اخبار القرون الاولی قال ابوسفیان انی لاادری بعض ما یقول حقا فقال ابوجہل کلا فانزل اللہ تعالی تلك الآیہ۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں، (شدید ترین کفار مکہ) ابوسفیان، ولید، نضر، عقبہ، عتبہ، شیبہ، امیہ، ابی اور حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپؐ کا کلام سنا، لوگوں نے نضر سے پوچھا، کہ محمدؐ کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا، کہ یہ تو میں نہیں جانتا، کہ وہ کیا کہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ لب ہلاتا ہے اور اگلوں کے قصے کہتا ہے، جس طرح میں تم کو گذشتوں کے قصے بیان کیا کرتا تھا، ابوسفیان نے کہا کہ محمدؐ جو کہتا ہے، اس میں سے بعض باتیں تو سچی معلوم ہوتی ہیں، ابوجہل نے کہا "ہرگز نہیں"۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی،

خود ان آیات پر غور کرنا چاہیے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں،

اساطیر الاولین کے مواقع | قرآن مجید میں یہ لفظ نو جگہ آیا ہے، لیکن ہر جگہ ان معانی کے سوا جو ہم نے بیان

کہے ہیں، کوئی اور معنی نہیں بن سکتے، چہ جائیکہ کسی کتاب کے نام کی طرف اشارہ ہو. ہم ان تمام آیتوں کو نقل کرتے ہیں:

(۱) يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۱) کافر کہتے ہیں، کہ یہ قرآن، تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۲) وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۲) جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، ہم سن چکے، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے. یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۳) ان منافقین سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے خدا نے کیا نازل کیا، تو کہتے ہیں، وہی اگلوں کی کہانیاں،

(۴) قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۴) حیرت سے کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر جائیں گے، اور مر کر صرف مٹی اور ہڈی رہ جائیں گے، تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے یہ تو ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے بزرگوں سے بھی کہا گیا تھا، یہ کچھ نہیں، یہ خیالات تو صرف پرانے لوگوں کی قصہ کہانی کی باتیں ہیں،

(۵) قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۵) کافر کہتے ہیں، کہ یہ قرآن اختراع ہے خدا کی طرف سے نہیں، محمدؐ نے خود گڑھا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کو مدد دی ہے،

أَكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ یہ تو پہلوں کی کہانی ہے، جسکو محمدؐ نے لکھا لیا ہے، اور صبح و شام اسکو پڑھ کر سنایا جاتا ہے،

(الفرقان۔)

(۶) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ لَقَدْ وُعِدْنَا هَٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ

(۶) کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے اسلاف مٹی ہو جائیں گے، ہم پھر قبر سے نکالے جائیں گے؟ یہ تو ہم سے اور ہم سے پہلوں سے یہی وعدے کیے گئے تھے، کچھ نہیں یہ تو صرف اگلوں کی کہانی ہے،

(۷) وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ

(۷) جس کافر بیٹے نے اپنے مسلمان ماں باپ کو جھڑک کر کہا کیا تم دونوں اس کا مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ قبر سے اٹھایا جاؤں گا، مجھ سے پہلے کتنی قومیں گذر گئیں، (اور ان کا نشان بھی نہیں) اس کے ماں باپ اس کو خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ اے بدبخت ایمان لا! خدا کا وعدہ سچا ہے. بیٹا کہتا ہے کہ یہ صرف پرانے لوگوں کی کہانی ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا عذاب واجب ہو چکا،

(سورۃ الاحقاف ۔ ۱۸-۱۷)

(۸) وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَهِينٍ هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ

(۸) تو ان کی اطاعت نہ کر جو ذلیل ہیں، اور قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں، جو عیب جو اور غماز ہیں، جو اس لیے کہ صاحب فرزند و مال ہیں نیکی سے لوگوں کو روکتے ہیں، جو حد سے متجاوز

اٰیاتنا قال اساطیر الاوّلین

ہیں، جو گنہگار ہیں، اور جو بدنہاد و بداصل ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو (بے پروائی سے) کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں،

(ن - ۱۵-۱۰)

(۹) وَ مَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ

(۹) قرآن کی تکذیب وہی کرتے ہیں جو ظالم اور گنہگار ہیں، ان کو جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو کہتے ہیں، کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں،

(سورۃ المطففین - ۱۲-۱۳)

خلاصہ قرآن مجید کی ان آیات کریمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اساطیر کسی کتاب دینی کا نام نہیں ہے، جس سے قرآن ماخوذ ہو، بلکہ کفار کا اس سے مقصود کہیں تو یہ ہے کہ اس میں قصے اور کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں، اور کہیں یہ مقصود ہے کہ قیامت، معاد اور حیات مابعد الموت کچھ معقول بات نہیں صرف اگلوں کی بیہودہ کہانی ہے، جس پر پرانے لوگ اپنی بیوقوفی سے یقین رکھتے تھے،

بدقسمتی دیکھو کہ یہ بعینہٖ وہی اعتقاد فاسد ہے، جو کبھی کفار کا تھا، اور آج ان مسلمان متفرنجین کا ہے جو قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے، جو خدا کے ظہور و جلال کے منکر ہیں، جو اعمال کے مواخذہ سے بے پروا ہیں، مرنے والو! کیا موت تمہیں کبھی نہ آئے گی، ہاں! ایک بار آئے گی جس کے بعد تم کو زندہ چھوڑ کر پھر کبھی نہ آئے گی،

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ

جو قیامت کے منکر ہیں، وہ یقیناً نقصان اٹھائیں گے جب ناگہاں وہ گھڑی آجائیگی تو حسرت سے کہیں گے، اس گھڑی کی نسبت ہماری سست اعتقادی پر افسوس (خاموش کہ اب افسوس و حسرت کا وقت نہیں)

مَا يَزِرُوْنَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ
اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ، وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.

(سورۃ الانعام - ۴۱۰۲'۲)

آج ان کی پشت گناہ کے بوجھ سے گراں ہے،
کیا برا بوجھ ہے، مغرورو! تم جس دنیا کی زندگی
پر مغرور ہو، اس میں لہو و لعب کے سوا اور
کیا دھرا ہے، دار آخرت نیک لوگوں کیلئے
بہترین محل اقامت ہے، نادانو! کیا نہیں سمجھ سکتے،

(الہلال کلکتہ، ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء)